سورہ الحج کا بیان (حصہ اول)

آیات ۱ تا ۵۱

سورہ الحج

سورہ حج مکی سورت ہے. سورت کی متعدد اندرونی شہادتوں کی بنیاد پر یہ واضح ہوتا ہے کہ اس سورت کا نزول ۱۲ نبوی کے حج اور ربیع الاول ۱۳ نبوی/۱ ہجری کے درمیان کسی وقت ہوا ہے کہ جب مسلمانان مکہ نے مدینہ ہجرت کرنا شروع کر دی تھی تاہم نبی کریم ﷺ ابھی مکہ میں ہی مقیم تھے۔ اس سورت کو مکہ میں نازل ہونے والی آخری سورت مانا جا سکتا ہے کیونکہ ابتدائی مدنی سورت، سورہ بقرہ اور اس سورت کے مضامین میں خاصی مماثلت ہے۔ سورہ الحج میں مسلمانان مکہ کو نئی اسلامی ریاست میں پیش آمدہ معاملات کو بخوبی نبرد آزما ہونے کی ہدایات ہیں کیونکہ ان کو اب مشرکین مکہ کے برخلاف ایک ایسی قوم کا سامنا تھا جو کہ حامل شریعت بھی تھی یعنی کہ یہود، ساتھ ہی انکو جہاد کی اجازت بھی عنایت کی گئی تھی۔ دوسری جانب مکہ کے وہ مشرکین جنھوں نے نبیؐ کی دعوت کو نہ صرف مسترد کیا تھا بلکہ اس کی راہ میں روڑے اٹکائے ان کو ایک دنیاوی عذاب کا بتا دیا گیا جو کہ پھر غزوہ بدر کی صورت میں ظاہر ہوا۔

اس سورت کا محور تین بنیادی نکات ہیں:

۱. ایمان بالقران

۲. ہجرت

۳. جہاد

قرآن کریم کی وہ سورتیں جن کے مضامین مروجہ شان نازول کی روایتوں کے باعث شدید انتشار کا شکار ہوئے ہیں ان میں سورہ حج سرفہرست ہے. مجاہد اور حضرت ابن عباسؓ سے منسوب قول یہ ہے کہ یہ سورت مکی ہے سوائے تین آیات کے -ھذان خصمان سے لے کر تین مکمل آیات تک، جبکہ ایک دوسری روایت میں حضرت ابن عباسؓ سے ہی منسوب کیا جاتا ہے کہ یہ چار آیات ہیں عذاب حریق تک۔ ابن ضحاک اور حضرت ابن عباسؓ سے یہ بھی منسوب کیا جاتا ہے کہ یہ مدنی سورت ہے۔ جب کہ قتادہ کا قول ہے یہ مدنی ہے سوائے چار آیات کے، ۵۲ سے ۵۵ تک آیات مکی ہیں۔ نقاش نے مدینہ طیبہ میں نازل ہونے والی آیات کو ۱۰ شمار کیا ہے۔

قرطبی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ جمہور نے کہا کہ یہ ملی جلی سورت ہے جس میں بعض آیات مکی ہیں اور بعض مدنی۔ قرطبی کے مطابق یہ قول زیادہ صحیح ہے اس لیے کہ آیات اسی کا تقاضہ کرتی ہیں کیونکہ یا ایھا الناس مکی ہے اور یا ایھا الذین امنوا مدنی ہے۔ غزنوی نے کہا کہ یہ عجیب سورتوں میں سے ہے، یہ رات اور دن میں، سفر اور حضر میں، مکہ اور مدینہ میں، صلح اور جنگ میں نازل ہوئی، اس میں ناسخ بھی ہے اور منسوخ بھی، محکم آیات بھی ہیں اور متشابہ بھی، تعداد مختلف ہے۔

سید قطب کہتے ہیں کہ یہ سورت مکی ہے اور مدنی بھی. اس کی بعض آیات کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ مدنی ہے خصوصاً ان آیات سے جس میں قتال کی اجازت دی گئی ہے (آیات ۳۸ تا ۴۱) پھر اس آیت سے جن میں بدلہ لینے کی اجازت دی گئی ہے (آیت ۶۰)۔ ان آیات سے یہ قطعی طور پر مدنی معلوم ہوتی ہے کیونکہ مسلمانوں کو جنگ اور قصاص کی اجازت صرف ہجرت کے بعد دی گئی تھی جب مدینہ میں ایک اسلامی مملکت قائم ہو گئی تھی۔ اس سے قبل ان باتوں کی اجازت نہ تھی۔

امین احسن اصلاحی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ سورت اپنے مزاج اور مطلب کے اعتبار سے مکی ہے۔ اس کی صرف چار آیات ۳۸ تا ٤١ مدنی ہیں جن میں مسلمانوں کو اجازت دی گئی ہے کہ اگر وہ حج کے لئے جائیں اور کفار اور قریش ان کو بزور روکنے کی کوشش کریں تو ان کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مدافعت میں تلوار اٹھا لیں۔ آگے مزید کہتے ہیں کہ انہی چند آیات کی بنا پر ہمارے مفسرین نے اس سورہ کے مکی یا مدنی ہونے کے باب میں اختلاف کیا ہے. لیکن کسی مکی سورت میں چند مدنی آیتیں داخل ہو جانے سے جب کہ ان آیات کی نوعیت بھی محض توضیحی آیات کی ہو پوری سورہ کو مدنی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ آگے فرماتے ہیں صاحب کشاف نے بھی اس سورہ کو با اشتثنیٰ چند آیات مکی ہی قرار دیا ہے. دوسری جانب مولانا مودودی صاحب کی رائے ہے کہ ابتدائی ٢٤ آیات مکی اور باقی مدنی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ آخر اس سورت کے دور نزول پر اتنے زیادہ اختلافات کیوں پیدا ہوئے۔ دراصل اس سورت کی متعدد آیات کے متعلق بعض گروہوں نے اپنے مذہبی اور سیاسی مقاصد کے لئے پہلی اور دوسری صدی میں ایسی ایسی روایات بیان کی ہیں کہ اس سورت کا اپنا نظم مکمل طور پر منہدم ہو گیا ہے۔ اگرچہ مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی سمیت کئی جدید علماء نے روایات سے ماورا ہو کر بھی سورت کا ربط تلاش کرنے کی کوشش کی ہے تاہم پھر بھی وہ اس کا دور نزول مکمل طور پر متعین نہیں کر پائے ہیں۔

ان متضاد شان نازولوں نے سورت کے حقیقی مضامین کو گہنا کر جو نئے اور خطرناک مضامین اس سورت سے جوڑے ہیں وہ یہ ہیں.

١. شیطانی آیات کا مبینہ قرانی ثبوت

٢. خودکشی کا مبینہ قرانی جواز

٣. بنو ہاشم اور بنو امیہ کی خاندانی دشمنی کا مبینہ قرانی اشارہ.

اگرچہ ان تینوں باتوں کو ہی بہت سے علماء نے مختلف دلائل کی بنیاد پر رد کر دیا ہے لیکن ان تینوں نکات نے اور اس سورت سے متعلق بعض دوسری شان نازولوں نے سورت کے نظم کو جس طرح تہس نہس کیا ہے وہ پھر بحال نہ ہو سکا۔ اگر اس سورت کو اسی سورت سے فراہم کردہ شہادتوں کی بنیاد پر اس کے دور نزول میں جا کر پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت غالباً ایک ہی وقت میں نازل ہوئی ہے جو کہ اس دور کے گزشتہ عالمی اور مقامی حالات پر ایک تبصرہ اور پیش آئندہ واقعات پر رہنمائی فراہم کرتی ہے۔

سورہ الحج کا ایک ہی وقت میں نازل ہونے کے بارے میں بعض اندرونی شہادتیں:

سورہ الحج کی تفہیم میں آسانی کے لیے اسکو چار تقاریر پر تقسیم کیا جاسکتا ہے لیکن ان تقاریر میں موجود بعض آیات کا دوسری تقاریر سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ یہ پوری سورت بیک وقت نازل ہوئی.

١- سورت کی پہلی تقریر (آیت ١ تا ٢٤) میں اس وقت کے عرب اور اس کے گردونواح کے حالات کی مناسبت سے مختلف گروہوں کی/کو مثالیں دے کر سمجھایا گیا ہے۔

٢- دوسری تقریر (آیت ٢٥ تا ٣٨) کا بنیادی محور مشرکین مکہ کا حج کے موقع پر غلط طرز عمل کی نشاندہی ہے۔

٣- تیسری تقریر (آیت ٣٨ - ٦٦) میں ہجرت کی شرط کے ساتھ مسلمانان مکہ کو جہاد کی اجازت دی گئی ہے (٣٩-٤٠)

۴- چوتھی تقریر (آیت ٦٧ - ٧٨) میں مسلمانان مکہ کو بعد از ہجرت، ایک حامل شریعت امت (یہود) سے مکالمے کا بیان ہے

تیسری تقریر میں جب آیت ٤٠ میں جب مشیت الہی کا ذکر ہے تو پہلی تقریر میں بیان کردہ ایک گروہ کے اس وقت کے طرز عمل کا بالواسطہ حوالہ دیا جاتا ہے۔ دوسری تقریر (آیت ٢٥ تا ٣٨) کا اختتام جس آیت (آیت ٣٨) پر ہو رہا وہی آیت ٣٨ دراصل تیسری تقریر کا نقطۂ آغاز ہے۔ چوتھی تقریر (آیت ٦٧ - ٧٨) میں اگر ایک حامل شریعت امت (یہود) کے بعض شبہات کا بیان ہے تو وہیں یہود مدینہ کے اٹھائے گئے بعض سوالات کے جوابات سورت کی دوسری تقریر کی آیت ٣٦ میں بھی دے گئے ہیں۔ گویا سورت کے چاروں ذیلی مضامین ایک دوسرے میں باہم پیوست ہیں۔

سورہ الحج کے مکہ میں نزول کی اندرونی شہادت:

سورہ الحج کی آخری آیات (آیت ٧٧ تا ٧٨) میں جن مسلمانوں سے يٰـاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے صیغے سے خطاب ہوا ہے وہ درحقیقت مسلمانان مکہ ہی ہیں کیونکہ سورت کی آخری آیت ٧٨ میں ان کو اپنے باپ ابراہیمؑ کی ملت پر قائم ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ قریش اور مکہ کے گرد و نواح کے بعض قبائل، اولاد ابراہیمؑ تھے۔ جب کہ انصار مدینہؓ یمنی الاصل قحطانی قوم کی ذیلی شاخ تھے۔ سورت کی یہ اختتامی آیت جو کہ خاص مسلمانان مکہ کو خطاب کر رہی ہے یہ واضح کر دیتی ہے کہ اس سورت کا نزول مکہ المکرمہ میں ہوا تھا۔ آیت ٤٠ سے واضح ہوتا ہے کہ ہجرت کی ابتدا ہو چکی ہے اور آیت ٧٢ سے اشارہ ملتا ہے کہ رسول پاک ﷺ نے ابھی مدینہ منورہ ہجرت نہیں کی ہے۔ مشرکین مکہ کے حج کے موقع پر غلط طرز عمل کی سرزنش وضاحت کرتی ہے کہ ١٢ نبوی میں ہونے والا حج مکمل ہو چکا ہے۔ لہذا رسول اللہ ﷺ کی مکہ میں موجودگی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت کا نزول ١٣ نبوی/ ١ ہجری میں محرم سے ربیع الاول کے درمیان مکہ المکرمہ میں کسی وقت ہوا ہے۔

آیت ١ اور ٢کا بیان:

> يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱتَّقُواْ رَبَّكُمْۚ إِنَّ زَلْزَلَةَ ٱلسَّاعَةِ شَىْءٌ عَظِيمٌ (١) يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى ٱلنَّاسَ سُكَـٰرَىٰ وَمَا هُم بِسُكَـٰرَىٰ وَلَـٰكِنَّ عَذَابَ ٱللَّهِ شَدِيدٌ (٢)

سورہ حج کی یہ تقریر چوبیس آیات پر مشتمل ہے۔ سورت کا آغاز ہی لوگوں اور خاص طور پر اولین مخاطبین یعنی مشرکین مکہ کو قیامت کی ہولناکی سے آگاہ کر کے کیا جارہا ہے، کیونکہ انکا یہ عقیدہ تھا کہ دنیا جیسے قائم ہے ویسے ہی جاری و ساری رہے گی، نہ تو کبھی یہ ختم ہوگی اور نہ ہی کبھی دوسری زندگی کا سلسلہ شروع ہوگا۔ آیت ١ اور ٢میں ارشاد ہوتا ہے:

لوگو، اپنے رب کے غضب سے بچو، بیشک ناگوار گھڑی (الساعۃ) کا بھونچال بڑی (ہولناک) چیز ہے (١) جس روز تم اسے دیکھو گے، حال یہ ہو گا کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے سے غافل ہو جائے گی، ہر پیٹ والی اپنا پیٹ ڈال دیگی، اور لوگ تم کو مدہوش نظر آئیں گے، حالانکہ وہ نشے میں نہ ہوں گے، بلکہ اللہ کا عذاب ہی کچھ ایسا سخت ہوگا (٢)

آیت اپنے بیان میں بالکل واضح ہے کہ یہ اس دن کی منظر کشی کی جارہی ہے کہ جس دن اس دار العمل دنیا کی بساط لپیٹی جارہی ہوگی۔ ہولناکی کی شدت بیان کرنے کے لیے دنیاوی رشتوں میں سچا اور خالص ترین رشتہ یعنی کہ ماں کا احوال بیان کیا جارہا ہے کہ وہ بھی اپنے بچوں سے غافل ہوجائے گی۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ نے تفسیر ماجدی میں ماہرین عربیت صاحب کشافؒ اور صاحب کبیرؒ کے حوالے سے آیت میں وارد لفظ مرضعۃ کی بابت فرمایا ہے کہ "یہاں دودھ پلانے والی

کی عام حالت کا بیان نہیں کہ رضاعت کرنے والی مائیں اپنے شیرخوار بچوں کو بھول جائیں بلکہ مراد یہ ہے کہ جو ماں عین اس وقت دودھ پلارہی ہوگی اور بچہ اسکی چھاتیوں کو اپنے منہ میں لیا ہوگا، وہ بھی مارے ہول کے اس وقت اپنے بچہ کو چھوڑ بھاگے گی۔ یعنی مرضعۃ بالفعل و فی الضال نہ کہ محض بالقوہ۔"

دوسری جانب جامع ترمذی کی کتاب التفسیر میں خواجہ حسن بصری کی دو روایات درج ہیں، جن کے مطابق صحابی رسول حضرت عمرانؓ بن حصین نے فرمایا کہ:

" جب آیت «یا أیها الناس اتقوا ربکم إن زلزلة الساعة شيء عظیم» سے قول «ولکن عذاب الله شدید» تک نازل ہوئی (درج بالا دونوں آیات) تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت سفر میں تھے، آپ نے لوگوں سے فرمایا: ”کیا تم جانتے ہو وہ کون سا دن ہے؟“ لوگوں نے کہا: اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ آپ نے فرمایا: ”یہ وہ دن ہے جس دن اللہ آدم (علیہ السلام) سے کہے گا ”جہنم میں جانے والی جماعت کو چھانٹ کر بھیجو"--------(روایت خاصی طویل ہے)" (جامع ترمذی، کتاب التفسیر)

اس کے بعد امام ترمذیؒ کہتے ہیں: ١- یہ حدیث حسن صحیح ہے، ٢- یہ حدیث کئی راویوں سے حسن (بصری) بذریعہ عمرانؓ بن حصین کے واسطہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ حسن بصری نے ان آیات میں بیان کردہ بھونچال کو دنیا کی بساط لپیٹے جانے کے دن کی بجائے روز حشر سے متصف کردیا ہے، جس کی وجہ سے تفہیم میں سب سے بڑی مشکل تو یہ آئی کہ کیا میدان حشر میں حاملہ عورتیں اپنے حمل کے ساتھ اٹھیں گی، یا دودھ پلانے والی جب اٹھے گی تو چھاتیوں کو اپنے شیر خوار کے منہ میں دیے ہوئے اٹھے گی۔ دوسری چیز یہ کہ حسن بصری نے یہ روایت سننے کا دعوی جس صحابی یعنی حضرت عمرانؓ بن حصین سے کیا ہے، وہ تو ٧ ہجری میں ایمان لائے ہیں، یعنی اگر حسن بصری کے بیان کو درست مانا جائے تو اس سورت کا نزول مکہ تو کجا مدینہ کے بھی بالکل آخری دور میں ماننا پڑیگا کیونکہ حضرت عمرانؓ بن حصین تو خیبر کے زمانے میں ایمان لائے ہیں۔ جو سورت ہجرت کے بعد جہاد کی اجازت دے رہی ہو، جو سورت یہود سے مکالمہ کر رہی ہو، اسکی پہلی دو آیات کیا تب نازل ہوں گی جبکہ یہودیوں سے آخری جنگ (غزوہ خیبر) بھی ہوگئی ہو۔ یہ کیونکر ممکن ہے۔ باقی جزا و سزا کے دن عورتوں کا حاملہ ہونا اور دودھ پلانا چہ معنی دارد۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ تفسیر البیان میں ارشاد فرماتے ہیں 'روایات سے عین قیامت کے روز اور قیامت سے پہلے بھی زلزلہ کا وقوع ثابت ہے لیکن جس زلزلہ کا آیت میں ذکر ہے حدیث سے اس کا وقوع قیامت کے روز معلوم ہوتا ہے' (حسن بصری کی یہی روایت) آگے فرماتے ہیں 'تذھل کل مرضعۃ کے ظاہر الفاظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ قیامت کے روز بھی عورتیں بچوں کو دودھ پلائیں گی سو یا تو یہ التزام کرلیا جاوے اور کہا جاوے کہ جو جس حالت میں مرا ہے اسی حالت میں محشور ہوگا (یعنی کہ اٹھایا جائے گا)سو ممکن ہے کہ جو عورتیں حالت ارضاع میں مری ہیں انکی وہاں بھی یہی حالت ہو اور یا کلام کو مبنی تمثیل پر کہا جاوے'

مولانا تھانویؒ نے اس روایت کو آیت کے مطابق کرنے کے لیے یا آیت کو روایت کے مطابق کرنے کے لیے یہ تو فرمادیا کہ یہ مان لیا جائے کہ جو جس حالت میں مرا ہے وہ اسی حالت میں اٹھے گا، لیکن سوال یہ ہے کہ کتنی دودھ پلانے والی عورتیں ہیں، جو اس حالت میں مرتی ہیں کہ انکی چھاتیاں انکے بچوں کے منہ میں ہوں اور موت آجائے؛ اور بالفرض ایسا ہو بھی جائے، تو یہ بھی تو لازم ٹھہرنا چاہیے کہ وہ بچہ بھی اسی لمحے مرے، ورنہ اگر وہ بالغ ہوگیا، تو اسکا تو بروز حشر اپنا حساب کتاب ہونا ہوگا ، وہ اس دن اپنی ماں کے ساتھ چمٹا ہوا کیوں اٹھے گا ۔ تیسری چیز یہ کہ ماں بچہ اگر بالفرض عین دودھ پلوانے کے دوران ہی بیک وقت فوت ہوئے ہوں، تو بھی لواحقین انکو ایک قبر

میں تو دفن نہ کریں گے۔ رضاعت کی حالت میں اٹھنے کے لیے ساتھ دفن ہونا بھی تو ضروری ٹھہرتا ہے۔ گویا ایک ایسی مثال جسکے ہونے کے امکانات معدوم کی حد تک ہوں، اسکو عبرت کے طور پر اللہ تعالی کس واسطہ بیان کرے گا؛ مزید یہ کہ صحیح بخاری مسلم نسائی اور خود ترمذی میں سعید بن جبیر کے حوالے سے یہ روایت بھی موجود ہے کہ لوگ روز حشرغیر مختون اٹھیں گے۔ غیر مختون والی روایت سے یہ تو ثابت ہوا کہ دونوں روایات بیک وقت تو درست نہیں ہو سکتیں، کیونکہ تقریباً تمام مسلمان مرد مرتے وقت ختنہ شدہ ہوتے ہیں۔ آگے جب مولانا تھانویؒ نے جب دوسرا امکان مبنی بر تمثیل بیان کردیا، تو اس سے خود واضح ہوجاتا ہے کہ حسن بصری کی اس روایت کو قبول کرنے میں انکو کس درجہ دشواری پیش آرہی ہے۔

اب یہ دیکھتے ہیں کہ سورہ حج خود اس ناگوار گھڑی کے متعلق مزید کیا اشارے دے رہی ہے۔ آیا ان آیات میں میدان حشر کی کیفیت بیان ہوئی ہے یا قیامت سے بالکل پہلے کا بیان۔ قران میں الساعۃ کسی موعود یا ناگوار گھڑی کے لیے بیان ہوا ہے، اس کا لازمی مطلب روز حشریا قیامت سے بالکل پہلے کا بھونچال نہیں ہے۔ آیات کا سیاق و سباق واضح کرتا ہے کہ یہاں کس ناگوار گھڑی کی بات ہورہی ہے۔
سورہ حج میں کل ۳ مرتبہ الساعۃ کا لفظ آیا ہے؛ جس مین پہلا تو یہی ہے کہ جس کا ظاہری معنی قیامت سے بالکل پہلے کا زلزلہ بنتا ہے، اور حسن بصری کے مطابق یہاں میدان حشر کا تذکرہ ہے۔
اسی سورت میں موجود دیگر الساعۃ سے بات مزید واضح ہوجائے گی کہ یہاں کس کا تذکرہ ہورہا ہے۔
آیت ۷ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَأَنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيهَا وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُورِ (۷)

اور الساعۃ آ کر رہے گی، اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں، اور اللہ ضرور اُن لوگوں کو اٹھائے گا جو قبروں میں جا چکے ہیں (۷)

اس آیت میں الساعۃ سے مراد دراصل آیت ۱ اور ۲ میں بتائے گئے احوال کے لازم آنے کا اعادہ ہے اور اس کے بعد 'اور' کہہ کر قبروں میں موجود لوگوں کے اٹھائے جانے کے ذکر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ روز حشر کا ذکر اس سورت میں بتائے گئے الساعۃ کے بعد کا موقع ہے۔ گویا اس سورت میں بیان کیا گیا الساعۃ قیامت سے بالکل پہلے کی کیفیت کا بیان ہے۔

دوسری جانب آیت ۵۵ میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي مِرْيَةٍ مِنْهُ حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً أَوْ يَأْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيمٍ (۵۵)

انکار کرنے والے تو اس کی طرف سے شک ہی میں پڑے رہیں گے یہاں تک کہ یا تو اُن پر الساعۃ اچانک آ جائے، یا ایک بانجھ دن کا عذاب نازل ہو جائے (۵۵)

یہاں مشرکین مکہ کا ذکر ہورہا ہے، اور بانجھ دن سے مراد یوم بدر ہے، جو کہ ایک دنیاوی عذاب ہے۔ جو بھی شخص یوم بدر میں عذاب سے دوچار ہوا، اسکو روز حشر کا سامنا تو کرنا ہی پڑیگا، جبکہ یہاں الساعۃ کا لفظ 'أَوْ' کے ساتھ آیا ہے جسکے معنی 'یا' کے ہوتے ہین، یعنی مشرکین مکہ پر الساعۃ یا میدان بدر کی ذلت میں سے ایک کیفیت آئے گی۔ جبکہ حساب کتاب کی دن کی سختی تو مقتولین بدر نے بھی دیکھنی ہے، لہٰذا الساعۃ اور بانجھ دن میں سے ایک سے ثابت ہوا کہ یہاں بھی الساعۃ سے مراد میدان حشر کی سختی نہیں ہوسکتی۔ گویا یہ الساعۃ جو کہ سورت کی پہلی آیت کی توضیح کر رہا ہے یہی ثابت کرتا ہے کہ اس سورت میں جس الساعۃ کا ذکر ہوا ہے، وہ قیامت سے بالکل پہلے کا بھونچال ہے۔

جو لوگ اس نظریہ کے قائل ہیں کہ اگر شان نزول کی روایات نہ ہوتیں تو قران کی تفہیم ناممکن ہوجاتی، وہ صرف ان آیات کے حوالے سے حضرت تھانویؒ کے درج بالا اقتباسات سے اندازہ کر

سکتے ہیں کہ ان روایات نے آسانی نہیں بلکہ تفہیم میں دشواری پیدا کی ہے۔ وہ مفسرین کرام جو سورہ حج کو مکی مانتے ہیں، یا کم از کم ابتدائی حصے کو مکہ میں نازل شدہ مانتے ہیں، انہوں نے تو حسن بصری کی اس روایت کا عملی طور پر انکار کر ہی دیا ہے لیکن بہت سے ایسے لوگ جو اس الساعۃ کو قیامت سے پہلے کی کیفیت بھی مانتے ہیں،اور پھر بھی حسن بصری کی اس روایت اور بعض دیگر روایات کے اثر میں اس سورت کو مدنی مان لیتے ہیں۔ اور یہیں سے اس سورت کے مضامین کی تفہیم میں دشواری پیدا ہوتی ہے اور سورت کا نظم متاثر ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ اور آیات کا مفہوم آیات کے ربط کی بجائے شان نزولون کا مزید محتاج ہوجاتا ہے۔ اگر قران کی تفسیر میں سب سے پہلے قران کو ہی مد نظر رکھا جائے تو یہ دشواری کبھی پیدا نہ ہو، اور بہت سے لوگوں کی حقیقت بھی واضح ہوجائے۔ قران کریم کا یہ بہت بڑا اعجاز ہے کہ ایک آیت دوسری آیت کی تفسیر کردیتی ہے، اگر کوئی شان نزول کسی آیت کے بیان کا تعین بدلنے کی کوشش کریگی، تو کوئی دوسری آیت ضرور اسکا انکار کردیگی۔

دنیا کی بساط لپیٹے جانے کے ذکر کے فوراً بعد دنیا کے تین قسم کے گروہوں کا بیان ہوا ہے، جو کہ حق پر نہیں ہیں

۱. جن کے پاس کوئی علم (کتاب) نہیں ہے۔ (آیت ۳)

۲. جن کے پاس کتاب تو ہے لیکن وہ ہدایت کی طرف رہنمائی نہیں کر رہی۔ (آیت ۸)

۳. جن کے پاس اللہ کے احکامات تو ہیں گویا کتاب تو موجود ہے لیکن وہ نیم دلی سے عمل پیرا ہیں۔ (آیت ۱۱)

آیت ۳ تا ۷ کا بیان:

وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يُجَـٰدِلُ فِى ٱللَّهِ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ وَيَتَّبِعُ كُلَّ شَيۡطَـٰنٍ مَّرِيدٍ (٣) كُتِبَ عَلَيۡهِ أَنَّهُ ۥ مَن تَوَلَّاهُ فَأَنَّهُ ۥ يُضِلُّهُ ۥ وَيَہۡدِيهِ إِلَىٰ عَذَابِ ٱلسَّعِيرِ (٤) يَـٰٓأَيُّہَا ٱلنَّاسُ إِن كُنتُمۡ فِى رَيۡبٍ مِّنَ ٱلۡبَعۡثِ فَإِنَّا خَلَقۡنَـٰكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطۡفَةٍ ثُمَّ مِنۡ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضۡغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيۡرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمۡ‌ۚ وَنُقِرُّ فِى ٱلۡأَرۡحَامِ مَا نَشَآءُ إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخۡرِجُكُمۡ طِفۡلاً ثُمَّ لِتَبۡلُغُوٓاْ أَشُدَّكُمۡ‌ۖ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰٓ أَرۡذَلِ ٱلۡعُمُرِ لِكَيۡلَا يَعۡلَمَ مِنۢ بَعۡدِ عِلۡمٍ شَيۡـًٔا‌ۚ وَتَرَى ٱلۡأَرۡضَ هَامِدَةً فَإِذَآ أَنزَلۡنَا عَلَيۡہَا ٱلۡمَآءَ ٱهۡتَزَّتۡ وَرَبَتۡ وَأَنۢبَتَتۡ مِن كُلِّ زَوۡجِۭ بَهِيجٍ (٥) ذَٲلِكَ بِأَنَّ ٱللَّهَ هُوَ ٱلۡحَقُّ وَأَنَّهُ ۥ يُحۡىِ ٱلۡمَوۡتَىٰ وَأَنَّهُ ۥ عَلَىٰ كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيرٌ (٦) وَأَنَّ ٱلسَّاعَةَ ءَاتِيَةٌ لَّا رَيۡبَ فِيهَا وَأَنَّ ٱللَّهَ يَبۡعَثُ مَن فِى ٱلۡقُبُورِ (٧)

"بعض لوگ ایسے ہیں جو عِلم کے بغیر اللہ کے بارے میں بحثیں کرتے ہیں اور ہر شیطان سرکش کی پیروی کرنے لگتے ہیں (۳) حالانکہ اُس کے تو نصیب ہی میں یہ لکھا ہے کہ جو اس کو دوست بنائے گا اسے وہ گمراہ کر کے چھوڑے گا اور عذاب جہنّم کا راستہ دکھائے گا (٤) لوگو، اگر تمہیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تاکہ تم پر حقیقت واضح کر دیں ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھیرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچّے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمہیں پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی پُوری جوانی کو پہنچو اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے، پھر جہاں ہم نے اُس پر مینہ برسایا کہ یکایک وہ پھبک اٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اگلنی شروع کر دی (۵)

یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے، اور وہ مُردوں کو زندہ کرتا ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، (٦) اور یہ (اِس بات کی دلیل ہے) کہ الساعۃ (دنیا کے خاتمہ کی گھڑی) آ کر رہے گی، اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں، اور اللہ ضرور اُن لوگوں کو اٹھائے گا جو قبروں میں جا چکے ہیں(٧)"

پہلے گروہ کا ذکر آیت ٣ سے شروع ہو رہا ہے جو کہ آیت ٧ تک جاری رہا ہے۔ مشرکین مکہ بحیثیت مجموعی اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے پاس کوئی روشن یا غیر روشن کتاب تو کجا، کوئی کتاب سرے سے ہی موجود نہیں تھی، یعنی مکمل طور پر اُمی تھے۔ حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے دور کی بعض سنتیں تو اگرچہ ان کے یہاں کسی نہ کسی صورت میں چلی آرہی تھیں، تاہم عقائد کے سلسلے میں مکمل طور پر انحراف آچکا تھا، جن میں سے ایک بعد از موت دوبارہ زندہ کیا جانے کا انکار بھی تھا. آیت ٥ سے ٧ تک عقلی دلائل کے ذریعہ مشرکین مکہ کو عقیدہ آخرت اور دوبارہ زندہ کیے جانے پر توجہ دلائی گئی ہے۔

غور و خوض کے لیے پہلی مثال انسان کی پیدائش اور موت کے حوالے سے پیش کی گئی ہے، کہ اگر تم لوگ سمجھ رہے ہو کہ دنیا جیسے جاری وساری ہے ایسے ہی ہمیشہ برقرار رہے گی، تو زرا جنین پر غور کرو کہ اگر سب کچھ بس ایک ہی طریقہ پر جاری رہتا تو تمہارے اپنے مشاہدے میں ہے کہ بعض جنین تو صحتمند طریقہ سے نشونما پاتے ہیں، جبکہ بعض اس قاعدے سے انحراف کرتے ہیں، اسی طرح انسانی موت ہے، لوگوں کی اکثریت اگر طبعی عمر پوری کرتی ہے، تو کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو بھری جوانی میں مرجاتا ہے، جبکہ کوئی طبعی عمر بھی پار کرجاتا ہے۔ انسانی زندگی کے حوالے سے یہ دونوں مثالیں کیا یہ ثابت نہیں کرتیں کہ ہر چیز انسانی فہم کے دستور کی پابند نہیں ہوتی۔ اسی طرح اگر یہ دنیا تمہیں صدیوں سے جاری و ساری نظر آرہی ہے، تو اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ تمہاری تفہیم کے مطابق ہمیشہ جاری رہے گی۔ جیسے انسانی زندگیاں طبعی عمر سے آگے پیچھے ہوتی تمہیں اپنی نگاہوں سے نظر آرہی ہیں، اسی طرح یہ دنیا بھی ایسے ہی نہیں چلتی رہے گی بلکہ کسی وقت لپیٹ دی جائے گی۔

دوسری مثال انسانوں کے دوبارہ جی اٹھنے یعنی روز حشر کے حوالے سے مردہ زمین کے زندہ ہونے کی دی گئی ہے کہ تم لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو کہ کوئی زمین عرصہ دراز سے بنجر پڑی ہوتی ہے، جس میں زندگی کے آثار مفقود ہوچکے ہوتے ہیں مگر جونہی ادھر بارش ہوتی ہے، ادھر اس میں دوبارہ زندگی کے آثار نمایاں ہوجاتے ہیں۔ جب زمین کا مردہ اور زندہ ہوجانا تمہارے مشاہدے میں ہے، تو یہ ماننے میں کیوں تردد ہو رہا ہے کہ اللہ انسانوں کو بھی دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے۔ یہ مثال میدان حشر کے حوالے سے دی گئی ہے۔

دراصل رسول اللہ کی دعوت کو جھٹلانے کی سب سے بڑی وجہ ہی یہ تھی کہ مشرکین مکہ یہ بات ماننا ہی نہیں چاہ رہے تھے کہ وہ خدا کے آگے بھی مسئول ہونگے، لہذا دارالعمل کا خاتمہ اور دوبارہ جی اٹھنے کے بعد دارالجزا کا عقیدہ ان کے ماننے کے لے سب سے دشوار تھا۔

آیت ٨ تا ١٠ کا بیان:

وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يُجَـٰدِلُ فِى ٱللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَـٰبٍ مُّنِيرٍ (٨) ثَانِىَ عِطْفِهِۦ لِيُضِلَّ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ ۖ لَهُۥ فِى ٱلدُّنْيَا خِزْىٌ ۖ وَنُذِيقُهُۥ يَوْمَ ٱلْقِيَـٰمَةِ عَذَابَ ٱلْحَرِيقِ (٩) ذَٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدَاكَ وَأَنَّ ٱللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّـٰمٍ لِّلْعَبِيدِ (١٠)

"بعض اور لوگ ایسے ہیں جو کسی علم اور ہدایت اور روشنی بخشنے والی کتاب کے بغیر، گردن اکڑائے ہوئے (٨) خدا کے بارے میں جھگڑتے ہیں تاکہ لوگوں کو راہِ خدا سے بھٹکا دیں ایسے شخص

کے لیے دُنیا میں رُسوائی ہے اور قیامت کے روز اُس کو ہم آگ کے عذاب کا مزا چکھائیں گے (۹) یہ ہے تیرا وہ مستقبل جو تیرے اپنے ہاتھوں نے تیرے لیے تیار کیا ہے ورنہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے (۱۰)"

دوسرے گروہ کی تفہیم سے پہلے ایک پہلو پر نظر رکھنا بہت ضروری ہے اور وہ یہ کہ سورہ حج کی یہ تقریر (آیت ۱ تا ۲٤) قرآن کریم کا وہ واحد مقام ہے جہاں مجوس کا لفظ آیت ۱۷ میں استعمال ہوا ہے. مکہ المکرمہ کی آبادی مشرکین پر مشتمل تھی جن کا ذکر بحثیت مجموعی پہلے گروہ کے طور پر ہو چکا ہے. مکہ المکرمہ کے مضافات میں مسیحی میں آباد تھے، دوسری جانب مدینہ منورہ میں یہودیوں کی ایک بہت بڑی تعداد آباد تھی۔ مجوسیوں کا حجاز کی مقامی مذہبی تقسیم میں کوئی نمایاں حصہ نہ تھا. بالکل اسی طرح ایک اور مذہبی گروہ صابی کا ذکر بھی قرآن میں سب سے پہلی مرتبہ سورہ حج کی آیت ۱۷ میں ہی استعمال ہوا ہے. اگرچہ سورہ حج کے بعد نازل ہونے والی سورتوں، سورہ بقرہ اور مائدہ میں دیگر اہل کتاب گروہوں کے ساتھ بھی ان کا ذکر آیا ہے لیکن یہ گروہ بھی حجاز کے اندر قابل ذکر تعداد میں موجود نہیں تھا.

اگر سورت کی اس تقریر (آیات ۱ تا ۲٤) میں دو غیر مقامی مذہبی گروہوں کا ذکر کیا جا رہا ہے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہاں لوگوں کی جو مختلف نظریاتی تقسیم بیان کی گئی ہے وہ مقامی تناظر میں نہیں بلکہ عالمی تناظر میں کی گئی ہے. آیت نمبر ۸ اور ۹ میں جن لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے اور پھر ان کے انجام سے آگاہ بھی کیا جا رہا ہے وہ دراصل وہ لوگ ہیں جو بنا کسی علم اور کسی روشن (الہامی) کتاب کے خلق خدا کو گمراہ کر رہے تھے۔ اس گروہ کو سمجھنے کے لئے اس زمانے کی عالمی سیاست کو سمجھنا ہو گا. عرب کے عین شمال میں دو بڑی طاقتیں موجود تھیں. ایک جانب بازنطینی (رومی) عیسائی تھے تو دوسری جانب ساسانی (ایرانی) مجوسی تھے. مجوسی مذہب کے پاس بھی ایک کتاب موجود ہے جس کو اوستا کہتے ہیں. قرآن کریم نے اس کتاب کے لئے روشن (مبین) ہونے کا ذکر نہیں کیا، جبکہ تورات اور انجیل کے لئے کیا ہے.

ساسانی بادشاہ خسرو پرویز کی سلطنت دراصل رومی بادشاہ موریس کی مرہوں منت تھی. موریس کی بدولت ایران کی خراسانی فوجی بغاوت کو کچلا گیا تھا اور خسرو پرویز کو استحکام ملا تھا. اسی واسطے خسرو پرویز موریس کو اپنا باپ کہا کرتا تھا. رومی سلطنت میں عیسائی اقلیتی فرقوں نسطوری اور یعقوبی وغیرہ کے لئے زمین تنگ تھی. اور ان کی بڑی آبادی ساسانی سلطنت کے مغربی صوبوں میں آباد تھی. خسرو پرویز کی باثر ترین بیوی شیریں بھی ایسی ہی ایک عیسایئ تھی. جبکہ اس نے موریس کی عیسائی بیٹی سے بھی شادی کرلی تھی. ایران کے مجوسیوں میں خسرو پرویز کے اس عمل کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جا رہا تھا. موریس جب بلقان کے مغربی محاذ پر سلاوی قبائل سے نبرد آزما تھا تو اس کی فوج کے ایک کمانڈر فوکاس نے اس کو اور اس کے پانچ بیٹوں کو قتل کر کے بازنطینی سلطنت پر قبضہ کر لیا. خسرو پرویز کو یہ بہترین موقع ملا کہ وہ ساسانی سلطنت کو وسعت دے. اور اس نے موریس (اپنے منہ بولے باپ) کے قتل کا بدلہ لینے کے بہانے بازنطینی سلطنت پر حملہ کر دیا اور پے در پے بازنطینیوں کو شکستیں دیتا گیا۔ دوسری جانب فوکاس نہ تو سلطنت میں اندرونی استحکام لا پایا اور نہ ہی اس ساسانی بیرونی جارحیت کا مقابلہ کر سکا. نتیجتاً ہرقل نے اقتدار پر قبضہ کیا اور خسرو پرویز کو جنگ ختم کرنے کا کہا کیونکہ اب اس کے منہ بولے باپ کا قاتل فوکاس مارا جا چکا تھا. یہی وہ زمانہ تھا جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں نبوت کا اعلان کیا تھا۔

نبوت کے اعلان کے ساتھ ہی مکہ میں رسول اللہ ﷺ اور ان کے ساتھیوں کی شدید مخالفت شروع ہو چکی تھی. قرآن کا تدریجاً نزول جاری تھا اور ہر سورت کے نزول کے ساتھ ساتھ جہاں مخالفت کی

شدت میں اضافہ ہو رہا تھا وہاں مسلمانوں کی تعداد بھی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی. اور پھر جب سورہ مومنون نازل ہوئی تو پہلی بار حضرت عیسیٰ کا ذکر، حضرت مریمؑ کے بیٹے کے طور پر اچھے الفاظ میں کیا گیا. اور یہاں سے مشرکین کی زبان حضرت عیسیٰ کے خلاف بھی کھلی جس کا ذکر حضرت عیسیٰ کے حوالے سے اگلی نازل ہونے والی سورت زخرف میں بیان ہوا ہے. تناؤ کے اس ماحول میں مشرکین کی پوری ہمدردیاں ساسانی رومی جنگ میں ساسانیوں کے ساتھ ہو گئیں اور وہاں صورت حال یہ تھی کہ رومیوں کو پے در پے شکست ہو رہی تھی. پانچ نبوی کے اس پاس عیسائیوں کے مقدس ترین شہر یروشلم پر بھی ساسانی قبضہ ہو گیا. شہر کو خون سے نہلا دیا گیا، کنیسہ قیامہ کو تباہ کر دیا گیا. مقدس صلیب کو ساسانی سلطنت میں پہنچا دیا گیا.

یہ وہ موقع ہے جب مشرکین مکہ مسلمانوں کا اس حوالے سے تمسخر اڑا رہے تھے کہ جب عیسائی دنیا کا مقدس ترین شہر خسرو پرویز کے ہاتھوں تاراج ہوا. اس کے بعد سورہ روم کا نزول ہوا جس میں بیان کیا گیا کہ عنقریب رومی (ساسانیوں/مجوسیوں پر) غالب آ جائیں گے. عالمی سیاست کے حوالے سے یہ پہلی سورت تھی تاہم اس میں مجوس کا لفظ استعمال نہیں ہوا تھا گویا ان کا ذکر انکا نام لئے بغیر ہی کر دیا گیا. یروشلم کی شکست کے تھوڑے عرصے بعد وہ حالات ائے جب ہرقل نے صلح کی پیشکش کی تو خسرو پرویز نے غرور کے پندار میں لپٹا ہوا جواب بھیجا جس کا آغاز اس طرح سے تھا

"سب خداؤں سے بڑے خدا، تمام روئے زمین کے مالک، خسرو کی طرف سے اس کے کمینے ہرقل کے نام ... تو کہتا ہے تجھے اپنے رب پر بھروسہ ہے کیوں نہ تیرے رب نے قیصریہ، یروشلم اور اسکندریہ کو بچایا. ..."

اس کے بعد اس نے عیسائیوں کے بعض اعتقادات کی تضحیک بھی کی اور ہرقل کو عیسائیت سے تائب ہوکر اپنے زیر فرمان ہونے کا حکم دیا. گویا اب تک کی اپنی پالیسی کے برخلاف وہ اس جنگ کو مجوسیت اور عیسائیت کی جنگ کے رنگ میں بدل رہا تھا. خط کے الفاظ سے ہی اس کا غرور تکبر بہت واضح ہے. سورت کے نظم کے مطابق دیکھا جائے تو آیت ۸ میں خسرو پرویز اور اس کے حواریوں کا نقشہ کھینچا جا رہا ہے. جن کے پاس نہ تو کوئی روشن کتاب تھی مگر پھر بھی گردن اکڑائے ہوئے لوگوں کو مزید گمراہی کی طرف دھکیل رہے ہیں. آگے بتایا گیا کہ ان لوگوں کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں تو عذاب کا مزہ چکھنا ہی ہے.

۷ ہجری میں صلح حدیبیہ کے بعد جب رسول اللہ نے عالمی لیڈروں کو اسلام کی دعوت دی تو خسرو پرویز کو بھی حضرت عبدﷲ بن حذافہ سامی کے ذریعہ خط بھیجا گیا جس کو اس نے تکبر میں آکر پھاڑ کر پھینک دیا اور خسرو کا انجام یہ ہوا کہ اس وقوعے کے کچھ ہی دن بعد اپنے ہی سگے بیٹے قباد کے ہاتھوں مارا گیا. قباد نے اپنے باپ کی پالیسیوں کے برخلاف رومی عیسائیوں کا اکرام کیا اور انکی مقدس صلیب ان کے حوالے کردی.

آیت ۱۱ تا ۱٤ کا بیان:

وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَعۡبُدُ ٱللَّهَ عَلَىٰ حَرۡفٍۖ فَإِنۡ أَصَابَهُۥ خَيۡرٌ ٱطۡمَأَنَّ بِهِۦۖ وَإِنۡ أَصَابَتۡهُ فِتۡنَةٌ ٱنقَلَبَ عَلَىٰ وَجۡهِهِۦ خَسِرَ ٱلدُّنۡيَا وَٱلۡأٓخِرَةَۚ ذَٰلِكَ هُوَ ٱلۡخُسۡرَانُ ٱلۡمُبِينُ (١١) يَدۡعُواْ مِن دُونِ ٱللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُۥ وَمَا لَا يَنفَعُهُۥۚ ذَٰلِكَ هُوَ ٱلضَّلَٰلُ ٱلۡبَعِيدُ (١٢) يَدۡعُواْ لَمَن ضَرُّهُۥٓ أَقۡرَبُ مِن نَّفۡعِهِۦۚ لَبِئۡسَ ٱلۡمَوۡلَىٰ وَلَبِئۡسَ ٱلۡعَشِيرُ (١٣) إِنَّ ٱللَّهَ يُدۡخِلُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ جَنَّٰتٍ تَجۡرِي مِن تَحۡتِهَا ٱلۡأَنۡهَٰرُۚ إِنَّ ٱللَّهَ يَفۡعَلُ مَا يُرِيدُ (١٤)

"اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو کنارے پر رہ کر اللہ کی بندگی کرتا ہے، اگر فائدہ ہوا تو مطمئن ہو گیا اور جو کوئی آزمائش آگئی تو الٹا پھر گیا اُس کی دنیا بھی گئی اور آخرت بھی؛ یہ ہے صریح خسارہ

(١١) پھر وہ اللہ کو چھوڑ کر اُن چیزوں کو پکارتا ہے جو نہ اُس کو نقصان پہنچا سکتی ہیں نہ فائدہ؛ یہ ہے گمراہی کی انتہا (١٢) وہ اُن لوگوں کو پکارتا ہے جن کا نقصان اُن کے نفع سے قریب تر ہے؛ بدترین ہے اُس کا مولیٰ اور بدترین ہے اُس کا رفیق (١٣) بیشک اللہ اُن لوگوں کو جو ایمان لائے (اس کتاب پر) اور جنہوں نے نیک عمل کیے، یقیناً ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اللہ کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے (١٤)"

آیت ١١ سے تیسرے گروہ کے ذکر کا آغاز ہو رہا ہے جو کہ نیم دلی سے اللہ کی عبادت کر رہے تھے اور اس کا اختتام آیت ١٦ پر ہو رہا ہے. اس کے فوراً بعد آیت ١٧ میں ایمان لانے والوں اور مختلف مذہبی گروہوں کے درمیان قیامت کے روز فیصلہ کر دینے کی بات کی گئی ہے۔ آیت ١٧ میں مشرکین اور مجوس کے علاوہ اہل کتاب کے مذہبی گروہوں کا ذکر ہے، گویا سورہ الحج کی اس تقریر کا نظم خود واضح کر دیتا ہے کہ یہاں کنارے پر رہ کر اللہ کی عبادت کرنے والوں سے مراد دراصل اہل کتاب ہی ہیں. ترتیب میں بھی یہی بات درست لگتی ہے، کہ آیت ٣ میں بیان کردہ پہلا گروہ وہ ہے کہ جس کے پاس کوئی علم نہیں ہے، جبکہ آیت ٨ میں بیان کردہ دوسرے گروہ کے لیے اس میں مزید اضافہ ہے کہ انکے پاس روشن کتاب نہیں ہے۔ اب جب تیسرا گروہ بیان ہورہا ہے، جو بہرحال اللہ کی عبادت بھی کر رہا ہے مگر اپنی خواہشات کے تابع رکھ کر، تو وہ وہی گروہ بنتا ہے کہ جسکے پاس اس وقت روشن کتاب بھی موجود ہو، کہ جو حق کی جانب گامزن تو کر رہی ہو لیکن اسکی پیروی کرنے کے دعویدار حق کی جانب گامزن ہونا نہ چاہ رہے ہوں۔

قرآن کریم کی دعوت کی ابتداء اگرچہ مکہ کے باشندوں کو لیکر شروع ہوئی تھی تاہم بعد میں دعوت کا دائرہ بتدریج بڑھا. یہاں تک کہ مکہ میں ہی جب سورہ الاعراف نازل ہوئی تو آیت ١٥٧-١٥٨ میں واضح طور پر اہل کتاب کو نبی اُمی حضرت محمّدؐ پر ایمان لانے کا کہہ دیا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے

"(اہل کتاب میں سے) جو اِس پیغمبر، نبی اُمی کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر اُنہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے.... وہی فلاح پانے والے ہیں (١٥٧) اے محمدؐ، کہو کہ اے انسانو، میں تم سب (اُمی اور کتابی) لوگوں کی طرف اُس خدا کا پیغمبر ہوں ... پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی اُمی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے، اور پیروی اختیار کرو اُس کی، امید ہے کہ تم راہ راست پا لو گے" (١٥٨) سورہ الاعراف

اہل کتاب اللہ کو تو مانتے تھے اور ان میں یہود عمومی طور پر موحد ہی تھے۔ ان یہودیوں کی ایک بڑی آبادی مدینہ میں آباد تھی اور وہ کسی حد تک تورات پر عمل پیرا بھی تھی۔ شروع سے ہی یہ قوم اس زعم میں مبتلا تھی کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کی اولاد ہونے کے ناطے وہ اللہ کے چنیدہ اور محبوب ترین بندے ہیں. مشرکین مکہ بھی اولاد ابراہیمؑ ہی تھے۔ وہ اور عرب کے کئی دیگر قبائل اپنے تئیں دین ابراہیمیؑ پر عمل پیرا بھی تھے تاہم وہ لوگ شرک جلی میں مبتلا ہو چکے تھے۔ لہٰذا ایک ہی سرزمین پر رہتے ہوئے اور ایک ہی نبی حضرت ابراہیمؑ سے نسبت رکھنے کے باوجود بھی یہودیوں اور مشرکین کے مذاہب میں زمین و آسمان کا فرق آ چکا تھا اور سرزمین عرب میں یہود تفاخر پر مبنی اپنی مذہبی انفرادیت برقرار رکھنے میں کامیاب رہے تھے. لیکن حضرت محمّد ﷺ کی بعثت کی صورت میں اولاد ابراہیمؑ کی غیر اسرائیلیؑ (اسماعیلیؑ) شاخ میں ایک نبی کا ظہور ہو گیا تھا جو یہودیوں سمیت تمام عالم کو دعوتِ حق دے رہا تھا جس کو قبول کرنے میں یہود کو انتہائی تردد ہو رہا تھا. نسلی تفاخر کی عینک سے دیکھ کر حق کی دعوت کو قبول و رد کرنے والے ان یہود کی اس عادت کا ذکر سورہ بقرہ کی آیت ٩١ میں ان الفاظ میں آتا ہے:

"جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ، تو وہ کہتے ہیں "ہم تو صرف اُس چیز پر ایمان لاتے ہیں، جو ہمارے ہاں (یعنی نسل اسرائیل) میں اتری ہے" اس دائرے کے

باہر جو کچھ آیا ہے، اسے ماننے سے وہ انکار کرتے ہیں، حالانکہ وہ حق ہے اور اُس تعلیم کی تصدیق و تائید کر رہا ہے جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی .. "(۹۱) سورہ البقرہ

جیسا کہ ابتداء میں بیان کر دیا گیا ہے کہ سورہ الحج کا نزول اس وقت نازل ہوا جب مسلمانان مکہ کی طرف سے مدینہ ہجرت شروع ہو چکی تھی تاہم نبی پاک ﷺ ابھی مکہ میں ہی مقیم تھے. جب تک رسول اللہ ﷺ کی دعوت کا مرکز مکہ رہا، یہودیوں کے لئے پھر بھی عدم اطمینان کی بات نہیں تھی لیکن اب جب دعوت حق ان ہی کے دروازوں پر دستک دینا شروع ہو چکی تھی تو یہ ان کے لئے ایک آزمائش بنتی جا رہی تھی کہ ایک غیر اسرائیلی نبی کی دعوت کیونکر قبول کریں باوجود اس کے کہ وہ جان چکے تھے کہ یہ دعوت حق ہے.

آیت ۱۱ میں وضاحت کر دی ہے کہ کہ ایک غیر اسرائیلی نبی کو قبول کرنا اگرچہ ان کے لئے ایک آزمائش ضرور ہے، لیکن اگر اس کو قبول نہ کیا تو دنیا اور آخرت دونوں کا ہی خسارہ ہاتھ لگے گا.
اور آیت ۱۲ میں ارشاد ہوتا ہے کہ جب حق سے گریز اختیار کیا جاتا ہے تو انسان گمراہی میں مبتلا ہو کر اس حد تک گر جاتا ہے کہ ایسی چیزوں کو پوجنے لگتا ہے جو نفع اور نقصان دونوں ہی کا اختیار نہیں رکھتیں. بنی اسرائیل میں یہ گمراہی تاریخ کے کئی مواقع پر آئی ہے جب بت پرستی بھی قوم کے بعض حصوں میں در آئی. خود قرآن نے اس کی مثال دی کہ جب حضرت موسیٰؑ کی دعوت کو نیم دلی سے قبول کیا گیا تھا تو وہ موقع بھی آیا تھا کہ جب سامری نے بچھڑا بنا کر دیا اور انہی کی قوم کے لوگوں نے اس کی پرستش بھی شروع کر دی۔ گمراہی کی دوسری قسم آیت ۱۳ میں بیان کی گئی کہ حق پہنچاننے کے باوجود بھی تاویلیں کر کے اس کو مسترد کرنے کے لئے لوگ پھر ایسے لوگوں کی پیروی کرتے ہیں کہ جو ان کو مزید راہ راست سے ہٹا دیتے ہیں. ایسے ہی ساتھیوں کو بدترین رفیق بیان کیا گیا ہے. سورہ توبہ کی آیات ۳۰، ۳۱ میں ایسے ہی رفقاء کی بابت فرمایا گیا ہے

".... (اہل کتاب پر) خدا کی مار اِن پر، یہ کہاں سے دھوکہ کھار ہے ہیں (۳۰) انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے ...." (۳۱) (سورہ توبہ)

آیت ۱۴ میں ایمان لانے باعمل لوگوں کے لئے جنت کی بشارت دی گئی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں پر کس پر ایمان لانے کی بات ہو رہی ہے. اگر کوئی اس کو ایمان باللہ سمجھے تو جس گروہ (یعنی یہود) کے لئے یہ آیت آ رہی ہے تو وہ تو پہلے ہی اللہ پر ایمان رکھتے ہیں. یہاں پر صرف اسی ایمان کی بات ہو سکتی ہے جس کو ابھی تک انھوں نے قبول نہیں کیا تھا اور اس کو مسترد کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہے تھے. تقریر کے آغاز سے ہی مختلف گروہوں کا جب ذکر ہوا تو ان کی تقسیم علم اور کتاب کے حوالے سے بیان کی گئی ہے. اس بات کو مد نظر رکھا جائے تو اس آیت میں جس ایمان کی بات ہو رہی ہے وہ ایمان بالقرآن ہی ہے.

دوسری جانب سعید بن جبیر ان آیات کی شان نزول کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ بعض لوگ مدینہ آتے (اور اپنے اسلام کا اظہار کرتے) اس کے بعد اگر اس کی بیوی کے یہاں لڑکا پیدا ہوتا اور گھوڑی بھی بچہ دیتی تو وہ کہتے کہ یہ دین (اسلام) بڑا اچھا دین ہے، لیکن اگر ان کے یہاں لڑکا نہ پیدا ہوتا اور گھوڑی بھی کوئی بچہ نہ دیتی تو کہتے کہ یہ تو برا دین ہے۔ (صحیح بخاری، کتاب التفسیر)

تفسیر ابن ابی حاتم میں یہی روایت مزید تفصیل سے بیان ہوئی ہے اور اس کے مطابق ابن عباسؓ نے فرمایا کہ بدوی لوگ نبی کریم ﷺ کے پاس آتے تھے اور اسلام قبول کر لیتے تھے پھر جب وہ اپنے شہروں کی طرف لوٹتے اور اس سال خوب بارش ہوتی، شادابی سے لطف اندوز ہوتے، خوب بچے پیدا ہوتے تو کہتے ہمارا دین بڑا اچھا، پس وہ اس کی مضبوطی سے پکڑے رہتے اور اگر ان کو قحط سالی

کا سامنا کرنا پڑتا، برے بچے پیدا ہوتے، بارش نہ ہوتی تو کہتے ہمارے اس دین میں کوئی خیر نہیں پاس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی.

سعید بن جبیر کی یہ روایت بھی ان روایتوں میں سے ہے جس نے سورہ حج کو اس کے مقام سے ہٹا کر مدنی دور میں پہنچا دیا ہے. حالانکہ بالکل صاف واضح ہے کہ یہ آیت کوئی جدا پس منظر نہین رکھتی بلکہ ایک ایسی تقریر کا حصہ ہے جس میں مختلف نظریات کے لوگوں کا احوال بیان کیا جا رہا ہے. اگر تھوڑی دیر اس آیت کو اس روایت کے تابع کر کے دیکھ بھی لیا جائے تو بھی کئی سوالات اٹھتے ہیں. ایک انسانی حمل ۹ ماہ جب کہ گھوڑوں کا حمل ۱۱ ماہ کا ہوتا ہے، اگر پیمانہ یہی باتیں ہوتیں تو اس کے ادراک کے لیے تو کئی سال لگ جاتے، اور اس دوران تو متعدد مدنی سورتیں نازل ہو ہی رہی تھیں جہاں یہ موضوع جگہ پا سکتا تھا. روایت سے یہ تاثر مل رہا ہے کہ جو بدوی لوگ اسلام قبول کر رہے ہوتے تھے وہ اس امید پر کر رہے ہوتے تھے کہ اسلام قبول کر کے ان کو یہ دنیاوی فوائد حاصل ہوں. کیا اسلام کی دعوت اور نبی کریم ﷺ کی تبلیغ کا بنیادی محور دنیاوی فوائد تھے، کہ اس سے بلاوجہ ہی وہ لوگ ایسی امید باندھ لیتے اور وہ بھی اس صورت میں کہ جب دین کا داعی اور اولین پیروکار دنیاوی لحاظ سے انتہائی شدید سختیاں جھیل رہے ہوں، اپنے گھر بار چھوڑ کر دوسرے ملکوں اور شہروں مین پناہ لینے اور نقل مکانی کرنے پر مجبور ہوئے ہوں. مزید یہ کہ بیٹوں کی لالچ میں اسلام قبول کرنے والے بدویوں کو کیا خود یہ نظر نہیں آ رہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ تو خود چار بیٹیوں کے باپ ہیں اور انکے دو بیٹے بچپن میں ہی فوت ہو چکے ہیں.

یہ درست ہے کہ بعض لوگ کسی دنیاوی اغراض کے لئے دوسرے نظریے قبول کرتے ہیں اور اگر اس کے بعد اگر کوئی فائدہ یا نقصان ہو تو اس سے شگون بھی لیتے ہیں، لیکن مدینہ کا اس وقت جو ماحول تھا کہ جہاں مسلسل جنگ کے خطرات منڈلارہے تھے، وہاں کے مسلمانوں کی معاشی حالت ابتری کا شکار تھی کہ عموماً فاقوں کی نوبت رہتی تھی تو ایسے ماحول سے مالی فوائد کے لیے شگون لیکر کوئی دنیا پرست بدوی اسلام کیونکر قبول کرتا. مسلمان مفسرین کی ایک تعداد سورہ حج کی ابتدائی آیات کو مکی مانتی ہے جس کا احوال پہلے بیان کیا جا چکا ہے، گویا وہ سعید بن جبیر کی اس روایت کو عملاً مسترد کر رہے ہیں. لیکن اس صورت میں بھی اس روایت کا انکار کرکے عملا اقرار ہی کرلیا گیا ہے کہ ان آیات کو اس وقت کے مسلمانوں سے جوڑ کر سورہ حج کی اس تقریر کا تسلسل توڑ دیا ہے، جس کا سب سے زیادہ شکار بالکل اگلی آیات ہوئی ہیں۔

آیت ۱۵ اور ۱٦ کا بیان:

مَن كَانَ يَظُنُّ أَن لَّن يَنصُرَهُ ٱللَّهُ فِى ٱلدُّنْيَا وَٱلْأَخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ إِلَى ٱلسَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهُۥ مَا يَغِيظُ (۱۵) وَكَذَٰلِكَ أَنزَلْنَٰهُ ءَايَٰتٍۭ بَيِّنَٰتٍ وَأَنَّ ٱللَّهَ يَهْدِى مَن يُرِيدُ (۱٦)

"جس کو یہ خیال ہو کہ ہرگز مدد نہ کرے گا اس کی اللہ دنیا میں اور آخرت میں تو تانے ایک رسی آسمان کی طرف پھر قطع کر دے، پس دیکھے کچھ گیا اس کی تدبیر سے اس کے جی کا غصہ (۱۵) اور ایسی ہی کھلی باتوں کے ساتھ ہم نے اسے نازل کیا ہے اور ہدایت اللہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے (۱٦)"

آیت ۱۵اور ۱٦ دراصل آیت ۱۱ تا ۱٤ کا ہی تسلسل ہیں اور یہاں اسی تیسرے گروہ سے بات جاری ہے کہ جو کنارے پر رہ کر اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ کیونکہ یہ آیات اسی تقریر کا حصہ ہیں، لہذا ان آیات میں ضمائر میں ہی گفتگو جاری رکھی گئی ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ ضمائر پچھلی آیات اور تقریر کے اصل موضوع ہی کی طرف پھر رہی ہیں۔ لیکن حیرت ناک طور پر سورہ الحج کی آیت ۱۵ سے اتنے مختلف مطالب نکالے ہیں، کہ بعض خودکشی کے جواز اور حکم کی دلالت کرتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ آیت ۱۵ کا ترجمہ یوں کرتے ہیں "جو آدمی (مایوس) ہو کر ایسا خیال کر بیٹھتا ہے کہ اللہ دنیا اور آخرت میں اس کی مدد کرنے والا نہیں، تو (اس کے لئے زندگی کی کوئی راہ باقی نہ رہی) اسی چاہیے کہ ایک رسی چھت تک لے جا کر باندھ لے اور (اس میں گردن لٹکا کر زمین سے) رشتہ کاٹ لے. پھر دیکھے کہ اس تدبیر نے اس کا غم و غصہ دور کر دیا کہ نہیں؟"

آگے تشریح یہ بیان کرتے ہیں کہ "جس انسان نے امید و یقین کی جگہ شک و مایوسی کی راہ اختیار کی خواہ دنیا کی زندگی کے لئے ہو خواہ آخرت کی لئے، اسے سمجھ لینا چاہیے کہ اب اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں. ایسے آدمی کے لئے صرف یہی چارہ کار رہ جاتا ہے کہ گلے میں پھندا ڈالے اور زندگی ختم کر ڈالے! سبحان اللہ! انسانی زندگی کے تمام مسائل اس ایک آیت نے حل کر دیے. زندگی امید و سعی ہے اور موت مایوسی اور ترک سعی. پس اگر ایک بدبخت نے یہ فیصلہ کر لیا کہ خدا کے پاس اس کے لئے کچھ نہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی تو پھر اس کے لئے باقی کیا رہا؟ کیا ہے جس کے سہارے وہ زندہ رہ سکتا ہے؟ اور زندہ رہے تو کیوں زندہ رہے؟"

کم و بیش یہی رائے مولانا ثنا اللہ امرتسریؒ کی ہے. وہ فرماتے ہیں کہ "جو کوئی اپنے خیال میں یہ گمان کیے بیٹھا ہے کہ خداوند دنیا اور آخرت میں اس کی مدد نہ کرے گا بلکہ یونہی نسیاً منسیا کر دے گا یہ درست نہیں، بلکہ خدا اپنی کسی مخلوق کو نہیں بھولتا تاہم اتنا سمجھانے سے کسی کی تسلی نہ ہو اور وہ خدا کی نسبت بدگماں ہی ہو تو اسے چاہیے کہ اوپر چھت کی طرف ایک رسی تانے جس کے ساتھ اپنی پھانسی لگائے، پھر اسی رسی کو کاٹ دے جس کے کٹنے سے وہ زمین پر گر کر مر جائے گا. پھر وہ دیکھے کہ اس کی اس تدبیر سے اس کا رنج و غم جو خدا کی ذات کی نسبت کر رہا تھا رفع دفع ہو جائے گا؟"

اس بحث سے قطع نظر کہ شریعت محمدیؐ میں خود کشی جائز ہے بھی یا نہیں، یہ دیکھا جائے کہ اگر کوئی شخص مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا ہوا ہو تو قرآن اس کو امید کا راستہ دکھائے گا یا اس کو مزید مایوسی کی طرف دھکیلے گا کہ وہ اپنی زندگی کا اب خاتمہ ہی کر لے. قرآن کریم میں تو انبیاء کرام کے حوالے سے ایسی دعائیں موجود ہیں کہ جب ان پر سخت وقت آیا تو انھوں نے کن الفاظ میں اللہ سے رجوع کیا. مثلاً حضرت موسیٰؑ، حضرت یونسؑ، حضرت نوحؑ، حضرت ایوبؑ کی دعایئں موجود ہیں. جیسے سورہ القمر میں حضرت نوحؑ کی دعا

فَدَعَا رَبَّهُ أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانتَصِرْ (١٠)

یا سورہ قصص میں حضرت موسیٰؑ کی دعا

رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ (٢٤)

کوئی اگر اس سے یہ مطلب کہے کہ ناامیدی اگر آخری حد بھی پار کر جائے تو اس کے لئے یہ کہا گیا کہ اب چاہے کہ خودکشی بھی کر لے لیکن کیا یہی آیت اس بات کی گنجائش دے بھی رہی ہے کہ یہ مفہوم نکالا بھی جائے کیونکہ آیت کے اگلے ہی حصے میں فوراً بعد تو یہ کہا جا رہا ہے کہ "پھر دیکھے کہ اس تدبیر نے اس کا غم و غصہ دور کر دیا کہ نہیں؟" سوچنے کی بات ہے کہ جو شخص خود کشی کر ہی چکا ہو تو اس کے بعد وہ کیونکر دیکھ پائے گا کہ اس کی یہ تدبیر کارگر ہوئی ہے یا بیکار گئی. وہ تو اس دنیا سے اپنا رشتہ ہی کاٹ چکا ہو گا. مزید یہ کہ مولانا امرتسری اپنی تشریح میں فرما رہے ہیں کہ پھانسی کے بعد اپنی رسی کاٹے اور پھر زمین پر گرے. یہ کیسے ممکن ہے کہ جب انسان پھانسی پر جھول ہی چکا تو اسکے بعد وہ رسی کاٹے. ایک اہم نکتہ یہ بھی اٹھتا ہے کہ جو شخص اللہ ہی سے مکمل طور پر مایوس ہو چکا ہو تو وہ اللہ ہی کی بتائی ہوئی اس ہدایت پر عمل ہی کیوں کرے گا کہ اپنی زندگی ختم کرلے، وہ غیر اللہ کا در کیوں نہ کھٹکھٹائے گا؟ باقی اگر آیت ۱۱ تا ۱۴ کا مطالعہ کیا جائے تو وہاں بھی ایسے کسی شخص کا تاثر نہیں ابھر رہا جو اب مکمل طور پر

مایوس ہوگیا ہے، اور اسکو زندگی گزارنے کا کوئی راستہ نہیں سجھائی دے رہا لہٰذا اسکو خودکشی کی ترغیب یا حکم دیدیا جائے۔ وہاں تو آزمائش آنے پر الٹے قدموں پھرنے والوں کی حقیقت آیت ۱۲اور ۱۳میں خود واضح کردی ہے کہ الٹے قدموں پھرنے والے پھر ایسی چیزوں اور لوگوں کی طرف راغب ہوجاتے ہیں جو کہ ضرر رساں ہیں۔

انہی آیات کی خود کشی کے حوالے سے ایک دوسری تفسیر بھی کی جاتی ہے آیت میں وارد لفظ یَّنْصُرَہُ کے "ہُ" کی ضمیر خیال کرنے والے کی بجائے رسول اللہ ﷺ کی طرف پھیری جاتی ہے.

مولانا احمد رضا خان بریلویؒ ترجمہ کرتے ہیں"جو یہ خیال کرتا ہو کہ اللہ اپنے نبیؐ کی مدد نہ فرمائے گا دنیا اور آخرت میں تو اسے چاہیے کہ اوپر کو ایک رسی تانے پھر اپنے آپ کو پھانسی دے لے. پھر دیکھے کہ اس کا یہ داںوں کچھ لے گیا اس بات کو جس کی اسے جلن ہے."

کم و بیش یہی ترجمہ مولانا ثنا اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں بھی کیا ہے. علامہ ابن کثیرؒ اس کی تفسیر یوں بیان کرتے ہیں کہ "یعنی جو یہ جان رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ کی مدد نہ دنیا میں کرے گا اور نہ آخرت میں، وہ یقین مانے اس کا یہ خیال محض خیال ہے. آپؐ کی مدد ہو کر ہی رہے گی، چاہے ایسا شخص اپنے غصے میں ہار ہی جائے بلکہ اسے چاہیے کہ اپنے مکان کی چھت میں رسی باندھ کر اپنے گلے میں پھندا ڈال کر اپنے تئیں ہلاک کر دے".

جہاں تک مولانا ابولکلام آزاد کی تفسیر کا سوال ہے تو انھوں نے تو یَّنْصُرَہُ کے "ہُ" کی ضمیر اپنے حالات سے مایوس کسی بھی شخص کی طرف پھیری ہے. لیکن جب یہ ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف پھیری جائے گی تو لازماً سوال اٹھتا ہے کہ یہ خیال کرنے والا کون شخص ہو سکتا ہے کہ جس کو اللہ پھر خودکشی کر لینے کا جواز فراہم کر رہا ہے. کسی بھی دعوت کے نتیجہ میں تین گروہ پیدا ہوتے ہیں، ایک مومن، دوسرے منکر، اور تیسرے منافق. جہاں تک منکرین کا سوال ہے کہ اگر وہ یہ خیال کریں کہ اللہ اس نبیؐ کی دنیا اور آخرت میں مدد نہیں کرے گا تو یہ تو ان کے لئے خوشی کی بات ہے نہ کہ خودکشی کی. دوسری جانب منافقین کا گروہ ہے. منافقین تو ہوتے ہی وہ لوگ ہیں جو دنیاوی اغراض کے لئے ہر کشتی میں پاؤں رکھتے ہیں. اگر حالات سے ان کو یہ محسوس ہو رہا ہو کہ اللہ اس نبیؐ کی مدد نہ فرمائے گا تو وہ تو بلا جھجھک منکرین کے ساتھ مل جائیں گے اور وہ کس واسطے خودکشی کریں گے، ایسے لوگوں کا تو نظریہ ہوتا ہی صرف انکا دنیاوی مفاد ہے. پچھلی ہی آیات میں ایسے لوگوں کا دستور بیان ہوا ہی ہے کہ اگر ان پر کوئی آزمائش آتی ہے تو وہ غیر اللہ کے در بھی پکڑ لیتے ہیں. ایسا طبقہ خود کشی کا کوئی رجحان نہیں رکھتا.

تیسرے رہ جاتے ہیں مومنین. نبیؐ کی دعوت سے مخلص افراد میں سے اکا دکا افراد کے لئے یہ تو کسی معمولی درجہ میں فرض بھی کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس وقت کے حالات کی شدید سختی کے باعث مایوسی کی جانب دھکل گئے ہوں اور یہ سمجھے ہوں کہ اتنے سخت حالات شاید اب کبھی نہیں بدلیں گے اور زمین پر رسول اللہ اور مسلمان ایسے ہی سختیاں جھیلتے رہیں گے لیکن دنیاوی حالات سے مکمل طور پر مایوس شخص بھی یہ تو کسی طور بھی نہیں سوچ سکتا کہ اللہ اس رسولؐ کی آخرت میں بھی مدد نہیں کرے گا اگر تو وہ اس دعوت سے کسی درجے میں بھی مخلص ہو. پس اس ضمیر کو نبیؐ کی طرف پھیرنے کے بعد کوئی بھی ایسا گروہ نہیں بچتا جس پر خودکشی والی یہ بات پوری اتر سکے.

تفسیر درمنثور میں سیوطیؒ نے ابن جریر طبری، ابن ابی حاتمؒ، حاکم (انھوں نے اس کو صحیح کہا ہے) اور ابن مردویہؒ کے حوالے سے کہا ہے کہا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے تھے کہ جو گمان کرتا ہے کہ اللہ اپنے حبیب محمّد کی مدد نہیں کرے گا وہ رسی باندھ لے اپنے گھر کی چھت کے ساتھ اور اپنا گلا دبا دے حتی کہ مر جائے. دوسری جانب عبد بن حمیدؒ اور ابن ابی حاتمؒ کے حوالے سے

لکھا ہے کہ ابن عباسؓ یوں بیان کرتے تھے کہ جو گمان کرتا ہو کہ اللہ اسے رزق نہیں دے گا تو اسے ایسی رسی لینی چاہیے پھر اسے اپنے مکان کی چھت سے باندھنا چاہیے پھر اس کے ساتھ اپنا گلا دبانا چاہیے، پھر اس کو دیکھنا چاہیے کہ اس کو یہ عمل نفع دیتا ہے یا اسے رزق دیتا ہے.

دراصل یہ روایتیں ہی ہیں جنھوں نے ایک سیدھی سی آیت میں سے خود کشی کا جواز بھی ڈھونڈ نکالا ہے. اور سوچنے کی بات ہے کہ ایک ہی صحابیؓ سے یہ روایات بیان کی جا رہی ہیں لیکن خودکشی کے جواز کی وجوہات بالکل مختلف.

مفسرین کرام کی بڑی تعداد ایسی بھی ہے جس نے آیت ۱۵ کو خودکشی کے حوالے سے طنز یا جواز کے ساتھ نہیں جوڑا ہے، تاہم ان میں بھی پہلے گروہ کی طرح اس بات میں اختلاف ہو گیا ہے کہ اس آیت میں وارد لفظ 'ینصرہ' کی ضمیر 'ہ' کا مرجع کون ہے۔

ابو مسلم اصفہانیؒ اس ضمیر کو رسول اللہ ﷺ کی طرف پھیرتے ہیں آسمان تک پہنچ کر کاٹنے کے لیے اللہ کی مدد کو مراد لیتے ہیں اور اس کے معنی یوں بیان کرتے ہیں کہ نصرت الہی تو رسول کی تائید میں یقیناً ظاہر ہو گی. جو شخص اس بات پر ناراض ہو کہ یہ نصرت نبیؐ کو کیوں مل رہی ہے تو چاہیے کہ وہ کسی ذریعہ سے آسمان پر پہنچ جائے اور اس نصرت کا رشتہ دنیا سے کاٹ دے. امام قرطبیؒ کی بھی یہی رائے ہے.

دوسری جانب اس ضمیر کا مرجع رسول اللہ ﷺ کو مانتے ہوئے بھی آسمان تک پہنچ کر کاٹنے کی رائے وحی الہی کے حوالے سے بھی ملتی ہے۔ اسی رائے کو مد نظر رکھتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ آیت ۱۵ کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ:

" جو شخص یہ خیال رکھتا ہے کہ اللہ اپنے رسولؐ کی مدد دنیا اور آخرت میں نہیں کرے گا تو اسے چاہیے کہ ایک رسی آسمان تک تان لے اور پھر سلسلہ وحی کو کاٹ دے. تو غور کرنا چاہیے کہ آیا اس کی تدبیر اس کی ناگواری کی چیز کو موقوف کرا سکتی ہے؟ (۱۵)

یہی رائے مولانا اشرف علی تھانویؒ کی بھی ہے، فرماتے ہیں "نصرت الہیہ آپ کے ساتھ بوجہ نبوت اور وحی کے ہے. سو آپ کی ناکامی کی سعی کرنا اس وقت مفید ہو سکتی ہے کہ جب اس نبوت اور وحی کے قصے کو پاک کر دیا جاوے. سو یہ ہونے کا نہیں."

دوسری جانب ایک گروہ اس ضمیر کا مرجع خود گمان رکھنے والے شخص کو قرار دیتا ہے؛ یعنی جو شخص اپنے بارے میں یہ گمان رکھے کہ اللہ اسی کی دنیا و آخرت میں مدد نہیں کریگا. مولانا سید ابو الاعلی المودودیؒ نہ صرف اس ضمیر کو گمان کرنے والے کی طرف پھیرتے ہیں، بلکہ رسول اللہ ﷺ کی طرف پھیرے جانے کا رد بھی کرتے ہیں، کیونکہ انکا ماننا ہے کہ یہ سیاق و سباق سے غیر متعلق ہے۔

مولانا مودودیؒ صاحب فرماتے ہیں کہ "یہ گمان کرنے والا شخص وہی ہے جو کنارے پر کھڑا ہو کر بندگی کرتا ہے. جبتک حالات اچھے رہتے ہیں مطمئن رہتا ہے اور جب کوئی آفت یا مصیبت آتی ہے یا کسی ایسی حالت سے دوچار ہوتا ہے جو اسے ناگوار ہے تو خدا سے پھر جاتا ہے. اور ایک ایک آستانے پر ماتھا رگڑنے لگتا ہے. اس شخص کی یہ کیفیت کیوں ہے؟ اس لئے کہ وہ قضائے الہی پر راضی نہیں اور یہ سمجھتا ہے کہ قسمت کے بناؤ اور بگاڑ کے سب رشتے اللہ کے سوا کسی اور کے ہاتھ میں بھی ہیں. اور اللہ سے مایوس ہو کر دوسرے آستانوں سے امیدیں وابستہ کرتا ہے. اس بنا پر فرمایا جا رہا ہے کہ جس شخص کے یہ خیالات ہوں وہ اپنا سارا زور لگا کر دیکھ لے حتی کہ اگر آسمان کو پھاڑ کر تھگلی لگا سکتا ہو تو یہ بھی کر کے دیکھ لے کہ آیا اس کی کوئی تدبیر تقدیر الہی

کے کسی ایسے فیصلے کو بدل سکتی ہے جو اس کو ناگوار ہے. آسمان پر پہنچنے اور شگاف دینے سے مراد ہے کہ وہ بڑی سے بڑی کوشش جس کا انسان تصور کر سکتا ہو. ان الفاظ کا کوئی لفظی مفہوم مراد نہیں ہے."

مولانا مودودیؒ اور مولانا آزادؒ دونوں نے ینصرہ کا مرجع خود گمان کرنے والے کو مانا ہے، لیکن آسمان کی جانب رسی تاننے کے الفاظ سے قطعاً متضاد معنی لیے ہیں، مولانا آزادؒ فرماتے ہیں کہ جو اللہ کی مدد سے انتہائی درجہ میں مایوس ہو گیا ہو، تو وہ تو بس ایسا ہی ہے کہ اب چھت پر رسی تان کر خودکشی کرلے، دوسری جانب مولانا مودودیؒ اسی بات کو آسمان میں تھگلی لگانے کے استعارے کے طور لیتے ہیں، کہ اگر اللہ سے مایوس ہو گئے ہو تو اپنے تئیں آخری حد تک جاکر کوشش کرلو، اور دیکھو کہ جو چیز ناگوار ہے اسکو اپنے بل پر دور کر بھی سکتے ہو یا نہیں- یعنی ایک کوشش کرنے کا بالکل انکار کر رہا ہے، تو دوسرا ناممکنات کی حد تک کوشش کرنے کے چیلنج کا بیان کر رہا ہے-

مولانا مودودیؒ کی رائے قبول کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ آرہی ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت دونوں میں مدد نہ ہونے کے گمان کی بات کر رہا ہے، جبکہ انہوں نے آیات ١١ تا ١٣ کی روشنی میں جو رائے دی ہے وہ خالصتاً دنیاوی معاملہ کو لیکر بنتی ہے، کہ کوئی شخص قضائے الہی پر راضی نہیں ہے- اسی میں ایک پہلو مزید یہ بھی سامنے آتا ہے کہ مولانا مودودیؒ کے نذدیک اس سورت کی ابتدائی ٢٤ آیات مکی دور کے بالکل آخر کی ہیں، کیا مسلمانان مکہ پر انکی پیش کردہ تفہیم کے ساتھ اس آیت کا اطلاق ہو بھی سکتا تھا، جو کہ اتنے سالوں سے سختیاں جھیل رہے تھے لیکن اپنے نظریہ میں پوری طرح مستحکم کھڑے تھے- مکی دور کے بالکل آخر میں مدینہ کے شہری بھی اسلام لا چکے تھے، تاہم ان پر ابھی باقاعدہ آزمائشوں کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا، کہ ان میں سے بھی کسی پر ان آیات کا اطلاق کیا جاتا۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ بھی مولانا مودودیؒ کی رائے سے اتفاق رکھتے ہوئے فرماتے ہیں " جن لوگوں نے اس کا مرجع رسول اللہ ﷺ کو مانا ہے ان کی رائے سیاق و سباق کلام سے بالکل بے جوڑ ہے آیت میں اشارہ انہی دو دلوں اور منافقوں کی طرف ہے جن کا ذکر اپر سے چلا آ رہا ہے اور جن کا حال یہ بیان ہوا ہے کہ اگر انھیں آزمائش پیش آ جاتی ہے تو خدا سے مایوس و بدگمان ہو کر دوسروں کو مولی و مرجع بنا بیٹھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ پیش آمدہ مشکل سے خدا ان کو نہیں نکالے گا یا نہیں نکال سکتا". آسمان میں رسی تاننے کے متعلق وہ فرماتے ہیں کہ وہ مایوس شخص "آخری اور انتہائی تدبیر کر کے دیکھ لے" اور اس کو انھوں نے استعارہ مانا ہے جیسے ہماری زبان تھگلی لگانے کا استعارہ ہے".

شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ اسی آیت کی تفسیر ایک دوسرے انداز سے کرتے ہیں- وہ فرماتے ہیں:

"دنیا کی تکلیف میں جو خدا سے نا امید ہوکر اسکی بندگی چھوڑ دے اور جھوٹی چیزیں پوجے، جن کے ہاتھ نہیں، برا بھلا وہ اپنے دل کے ٹھہرانے کو یہ صورت قیاس کرلے جیسے ایک شخص اونچی رسی سے لٹک رہا ہے اگر چڑھ نہیں سکتا توقع تو ہے کہ رسی اوپر کھینچے تو چڑھ جاوے، جب رسی توڑدی، پھر کیا توقع، رسی کہا اللہ کی امید کو اور آسمان کو تانے یعنی اونچان کو"-

شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کی اس رائے کو ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے بھی اختیار کیا ہے- اور اسی رائے کو آگے بڑھاتے ہوئے جاوید احمد غامدی صاحب اس آیت کا ترجمہ یوں فرماتے ہیں:

"(اِنھیں بتاؤ کہ) جو یہ گمان رکھتا ہو کہ اللہ دنیا اور آخرت میں ہرگز اُس کی مدد نہ کرے گا، اُس کو چاہیے کہ (اپنے تصور میں ذرا) ایک رسی (اوپر چڑھنے کے لیے) آسمان کی طرف تانے، پھر (جب

منزل کو بہت دور دیکھ کر رنجیدہ ہو تو) اُس کو کاٹ دے اور دیکھے کہ آیا اُس کی یہ تدبیر اُس کے رنج کو دور کرنے والی بنتی ہے؟

غامدی صاحب اس آیت میں منظر کشی ایک انتہائی درجہ کے مایوس شخص کی کر رہے ہیں، لہٰذا آیت کے آخر میں انہوں نے لفظ 'غیظ' کا ترجمہ 'رنج' سے کیا ہے۔ لیکن اس لفظ کا ترجمہ 'غصہ' سے کیا جائے تو مایوس آدمی کا وہ تاثر نہیں ابھرتا ہے جو وہ پیش کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے مولانا مودودیؒ کی رائے، غامدی صاحب کی رائے کی نسبت آیت کے متن سے زیادہ قریب ہے۔

حاصل کلام:

مولانا مودودیؒ ہوں یا مولانا اصلاحیؒ، دونوں کے نذدیک ینصرہ کی ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف اس لیے نہیں پھیری جا سکتی کیونکہ انکے مطابق پچھلی آیات میں رسول اللہ ﷺ کا ذکر نہیں ہے، لہٰذا یہ بات اصولاً درست نہیں ٹھہرتی کہ کسی ضمیر کو ایک ایسی جانب پھیردیا جائے، جسکا پچھلی آیات میں تذکرہ ہی نہ ہو۔ مولانا مودودیؒ ہوں یا مولانا اصلاحیؒ، دونوں ان آیات کو مکی مانتے ہیں، لیکن پھر بھی کنارے پر رہ کر عبادت کرنے والوں کے لیے وہ سعید بن جبیر کی روایت کو ایک درجہ میں مسترد کرنے کے باوجود بھی قبول کر گئے ہیں۔ جبکہ سورت کے مضمون کے تناظر میں غور کیا جائے تو بالکل ہی دوسری بات سامنے آرہی ہے۔ اس سورت میں جن تین گروہوں کا ذکر ہو رہا ہے انکی تفریق میں علم اور کتاب کا حوالہ بہت بنیادی اساس رکھتا ہے۔ ان آیات ١٥-١٦ کے فوری بعد سورت میں جو آیت ١٧ بیان ہوئی ہے اس میں بعض اہل کتاب اور غیر اہل کتاب گروہوں کا ذکر ہے، پھر تقریر کی اختتامی آیت ٢٤ میں پھر مسلمانوں کو اچھے قول کی طرف ہدایت کی بات کی گئی ہے۔ دیکھا جائے تو اس پوری تقریر کا محور ہی نبی پاک ﷺ کی جانب آنے والی وحی ہے۔

لہٰذا سیاق و سباق کے تناظر میں بات کی جائے تو ان آیات کا وہی ترجمہ درست ہے، جو مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے پیش کیا ہے، کہ یہ ضمیر رسول اللہ ﷺ کی جانب ہی پھر رہی ہے، اور جو چیز قطع کرنے کی بات ہو رہی ہے، وہ وحی ربانی ہے۔ آیت ١١ تا ١٤ میں واضح کیا گیا تھا کہ یہاں اہل کتاب گروہوں اور ان میں بھی بالخصوص یہود مدینہ کی بات ہو رہی ہے، کیونکہ یہ وہ وقت تھا کہ جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ آنے والے تھے، اور ایک غیر اسرائیلی نبی کی دعوت کو قبول کرنا ان کے لیے سوہان روح ثابت ہو رہی تھا۔ آیت ١١ میں یہ بیان ہوا تھا کہ جب غیر قوم کے نبیؐ کو قبول کرنے کی آزمائش سامنے آئی ہے، تو الٹے قدموں نہ پھرو، کیونکہ پھر دنیا و آخرت دونوں کا خسارا رہے گا۔ آیت ١٢اور ١٣ میں دانستہ حق سے آنکھیں چرانے والوں کے انجام سے آگاہ کیا گیا ہے، آیت ١٤ میں ایمان لانے کی بات کی گئی ہے، اور ظاہر ہے یہودیوں کے تناظر میں یہ ایمان بالقران اور ایمان بالصاحب القران بنتا ہے، کیونکہ اللہ پر تو اس گروہ کا پہلے ہی ایمان تھا۔ یہ پس منظر اور یہودیوں کی دعوت کو رد کرنے کے حقیقی خلجان کو مدنظر رکھا جائے، تو کوئی وجہ نہیں بنتی کہ یہاں ضمیر رسول اللہ ﷺ کی جانب نہ پھیری جائے۔

پچھلی تقریر کے تناظر میں آیت ١٤ تا ١٦ کا ترجمہ

جو لوگ (اس وحی پر) ایمان لائے اور عمل نیک کرتے رہے خدا ان کو بہشتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں چل رہیں ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے (١٤) جو (کنارے پر رہ کر عبادت کرنے والا) شخص یہ خیال کرتا ہو کہ اللہ دنیا اور آخرت میں اس (صاحب وحیؐ) کی مدد نہیں کرے گا تو اسے چاہیے کہ آسمان تک ایک رسی لٹکائے، پھر (وحی کو) قطع کر دے، پس دیکھ لے کہ آیا اُس کی تدبیر کسی ایسی چیز (اس وحی کے نزول) کو رد کر سکتی ہے جو اس کو ناگوار ہے (١٥)

ایسی ہی کھلی کھلی باتوں کے ساتھ ہم نے اس (وحی) کو نازل کیا ہے، اور ہدایت اللہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے (١٦)

آیت ١١ میں فرمایا گیا تھا کہ اگر اہل کتاب تمہارے خیال میں سب درست چل رہا ہوتا ہے تو اللہ کی عبادت کر لیتے ہو، اور اگر کوئی آزمائش آجائے، جیسا کہ ایک اُمی نبیؐ کی دعوت پر ایمان لانے کی بات ہوئی ہے تو تم لوگ الٹے پیروں پھر رہے ہو۔ ایسا کروگے تو دنیا و آخرت میں خود اپنا نقصان کرو گے۔ آیت ١٢ میں انہی کی تاریخ سے بیان کیا گیا کہ جب یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے تو وہ مواقع بھی آتے ہیں کہ غیر اللہ کی پرستش شروع کردی گئی ہو، شمال کے دس قبائل میں تو یہ بیماری بہت بڑے طبقے میں آگئی تھی۔ آیت ١٣ مین ان کے رہبان و علماء کے حوالے سے بیان ہوا ہے کہ ان کی اندھی تقلید مین نفع کم اور نقصان زیادہ ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی دعوت میں رکاوٹ پیدا کرنے والوں میں ہراول دستہ یہود کے فریسی علماء کا ہی تھا۔ آیت ١٤ مین نبی کریم کی دعوت قبول کرنے والوں کو جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ آیت ١٥ مین بیان ہوا ہے کہ اپنے بغض میں تم اس نبیؐ کی دعوت میں روڑے اٹکاؤ گے یا لوگوں میں شکوک ہیدا کرنے کی کوشش کرو گے (جن کے کچھ حوالے اسی سورت کی اگلی آیات میں بھی دیے گئے ہیں) تو تم لوگ منہ کی ہی کھاؤ گے، آخری حربہ کے طور پر اگر آسمان پہنچ کر اس وحی کے سلسلے کو روک سکتے ہو تو یہ بھی کرکے دیکھلو، کیونکہ اسکو روک دینا تمہارے بس میں ہی نہیں ہے۔ اللہ تو اس نبیؐ اُمی کی مدد دونوں جہانوں میں ضرور کریگا، چاہے تم لوگ جتنا بھی پیچ و تاب کھالو۔ اور حق بات یہی ہے کہ اس نبیؐ کی دعوت کو قبول کرلو جس کا ذکر آیت ١٤ میں ہے۔

آیت ١٦ اور دور نزول کی اہمیت:

ان آیات پر ایک دیگر پہلو سے بھی غور کرنا ضروری ہے۔ آیت ١٥ کے فوری بعد آیت ١٦ میں اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے:

ایسی ہی کھلی کھلی باتوں کے ساتھ ہم نے اس (وحی) کو نازل کیا ہے، اور ہدایت اللہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے (١٦)

اگرچہ پورا قران ہی مبین ہے، لیکن یہاں تخصیص کے ساتھ آیت ١٥ کی بات ہورہی ہے۔ اللہ تعالیٰ دعوی کر رہا ہے کہ آیت ١٥ بالکل کھلی بات ہے، لیکن ہمارے سامنے ہے کہ یہ آیت مشکلات القران مین داخل ہوگئی ہے۔ صرف اسی مضمون میں چند اردو تراجم و تفاسیر کے حوالے سے کم از کم پانچ مختلف الخیال تفاہیم اس آیت کے متعلق پیش کی گئی ہیں۔ بالفرض اگر اولین مخاطب لوگوں کی تفہیم میں بھی اتنا ہی شدید تضاد ہوتا، تو آیت ١٦ کے حوالے سے ان کے ذہنوں میں سوال ضرور اٹھتا کہ یہ بات تو ہر گز بھی کھلی ہوئی نہیں ہے۔ یہ بات اس وقت اس لیے نہیں ہوئی کہ یہ سورت اُن لوگوں کے سامنے جب نازل ہو رہی تھی، اس وقت کے حالات ان کی نگاہوں میں تھے کہ یہ جاننا چنداں مشکل نہ تھا کہ کن لوگوں کے حوالے اس سورت میں دیے جارہے ہیں۔ قران کریم آج بھی اتنا ہی مبین ہے، وہ ایسی تمام سورتوں، جن کی تفہیم میں بعد کے لوگوں کے لیے اختلاف پیدا ہو سکے، ضرور ان سورتوں میں ایسے اشارے رکھتا ہے کہ انکا دور نزول متعین کیا جاسکے۔ آج بھی قران کو سمجھنے کے لیے شان نزولوں کی بجائے، سورتوں کی اندرونی شہادوتوں سے حاصل شدہ ان کے دور نزول کا تعین کیا جائے، تو مختلف الخیال لوگوں کے اس وقت کے نظریات ہمارے سامنے آجائیں گے، اور پوری سورت کی تفہیم نہایت سہل ہو جائے گی۔

ایک مزید پہلو:

شان نزولوں کے حوالے سے ایک پہلو اور بھی سامنے آتا ہے، کہ وہ تمام آیات جن میں یہود کا نام لیے بغیر ان کی سرزش ہو، کوئی نہ کوئی شان نزول ایسی ضرور ہوتی ہے جو ان متعلقہ آیات کا مخاطب

کسی دوسرے گروہ کی جانب پھیر دیتی ہے۔ تحویل قبلہ کا معاملہ ہو، مباہلہ کا قصہ ہو، سورہ جمعہ کی آخری آیت ہو یا سورہ حج کی زیر بحث آیات، تمام ہی جگھوں پر شان نزولوں نے یہود کی پردہ پوشی کرکے کسی دوسرے گروہ کو کٹہرے میں لا کھڑا کیا ہے۔ یہ بات اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ مسلمانوں کی دوسری اور تیسری پیڑھی میں ضرور کچھ ایسے لوگ شامل ہوئے تھے جو یہود کے ساتھ مل کر یحرفون الکلم عن مواضعہ کا کام کر رہے تھے۔

آیت ١٧ تا ١٨ کا بیان:

نَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَٱلَّذِينَ هَادُواْ وَٱلصَّـٰبِـِٔينَ وَٱلنَّصَـٰرَىٰ وَٱلۡمَجُوسَ وَٱلَّذِينَ أَشۡرَكُوٓاْ إِنَّ ٱللَّهَ يَفۡصِلُ بَيۡنَهُمۡ يَوۡمَ ٱلۡقِيَـٰمَةِۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيدٌ (١٧) أَلَمۡ تَرَ أَنَّ ٱللَّهَ يَسۡجُدُ لَهُ ۥ مَن فِى ٱلسَّمَـٰوَٲتِ وَمَن فِى ٱلۡأَرۡضِ وَٱلشَّمۡسُ وَٱلۡقَمَرُ وَٱلنُّجُومُ وَٱلۡجِبَالُ وَٱلشَّجَرُ وَٱلدَّوَآبُّ وَكَثِيرٌ مِّنَ ٱلنَّاسِۖ وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيۡهِ ٱلۡعَذَابُۗ وَمَن يُهِنِ ٱللَّهُ فَمَا لَهُ ۥ مِن مُّكۡرِمٍۚ إِنَّ ٱللَّهَ يَفۡعَلُ مَا يَشَآءُ ۩ (١٨)

"جو لوگ ایمان لائے، اور جو یہودی ہوئے، اور صابئی، اور نصاریٰ، اور مجوس، اور جن لوگوں نے شرک کیا، ان سب کے درمیان اللہ قیامت کے روز فیصلہ کر دے گا، ہر چیز اللہ کی نظر میں ہے (١٧) کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کے آگے سربسجود ہیں وہ سب جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، سورج اور چاند اور تارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان اور بہت سے ہیں کہ جن پر عذاب مقرر ہو چکا ہے اور جسے اللہ ذلیل و خوار کر دے اُسے پھر کوئی عزّت دینے والا نہیں ہے، اللہ کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے (١٨)"

یہ آیت سورہ الحج کی اس تقریر (آیات ١ تا ٢٤) کی مرکزی آیت ہے کہ جس میں دو ایسی بھی اقوام کا ذکر ہے کہ جن سے مذہبی حوالے سے مسلمانوں کا سابقہ اس وقت تک نہیں پڑا تھا۔ صابی اور مجوسیوں کا ذکر واضح کرتا ہے کہ یہاں بیان عالمی حالات کے تناظر میں کیا گیا ہے نہ کہ مقامی۔ قران کریم کا یہ واحد مقام ہے کہ جس میں مجوس کا ذکر کیا گیا ہے۔ مجوسی زرتشت کو ماننے والے ایران کی آتش پرست قوم تھے۔ اگرچہ دعوی انکا بھی یہی ہے کہ وہ توحیدی ہیں اور اہورا مزدا کائنات کا خدا ہے، تاہم مروجہ مجوسیت ثنویت کی قائل تھی، یزدان اور اہرمن کی صورت میں اچھائیوں اور برائیوں کے دو مختلف خدا موجود تھے۔ مجوسی اوِستا نامی کتاب کو بھی مانتے ہیں۔

دوسرا گروہ جس کا ذکر ہے وہ صابیوں کا ہے۔ قران مجید میں یہ پہلا مقام ہے کہ جب صابیوں کا ذکر ہوا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ ذاتی نہیں بلکہ صفاتی نام ہے۔ قران میں صابیوں کا ذکر جب بھی ہوا ہے تو اہل کتاب گروہوں کے ساتھ ہوا ہے۔ سورہ الحج کے بعد نازل ہونے والی سورتوں سورہ بقرہ اور سورہ مائدہ میں بھی صابیوں کا ذکر ہے، اور وہاں تو گفتگو ہی اہل کتاب سے ہو رہی ہے۔ تاہم سورہ الحج میں بھی صابیون کا ذکر دو مسلمہ اہل کتاب گروہوں یہودیوں اور نصرانیوں کے درمیان کیا گیا ہے۔ قران مجید میں صابی کا لفظ جب بھی استعمال ہوا ہے، تو مقابلہ میں نصاری کی مانند یہود کا لفظ استعمال نہیں ہوا بلکہ 'وہ جو یہودی ہوگئے' استعمال کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی معیت میں نبی اسرائیل کے بارہ قبیلے مصر سے نکلے ۔ بعد میں ایک وقت میں حضرت یوشع بن نون کی ہمراہی میں فلسطین میں داخل ہوئے۔ صدیاں بیت گئیں اور حضرت سلیمانؑ ان کے آخری مشترکہ حکمران رہے، حضرت سلیمانؑ کا تعلق قبیلہ یہودہ سے تھا۔ ان کی وفات کے بعد شمال کے دس قبائل نے بغاوت کردی اور سامریہ کے مقام پر اپنا نیا دالحکومت بنایا۔ جبکہ جنوب کے قبائل نے اس وقت اپنے آپکو یہودی قرار دیدیا کیونکہ ان میں سب سے بڑی تعداد یہودہ کی اولاد میں سے تھی، اور حکمران بھی یہودہ ہی کی اولاد میں سے تھا، انہوں نے اپنی مملکت کا نام بھی یہودہ رکھ لیا تھا۔ شمال کے ١٠ قبائل پر مشتمل اس قوم کو قران نے صابی کہا ہے کیونکہ بغاوت کرنے والے کے لیے صبا علیہ کا لفظ استعمال ہوتا

ہے۔ بعد کے ادوار میں اس قوم کے اندر یہودی قوم کے مقابلہ میں زیادہ گمراہیاں پیدا ہوئیں۔ یہاں تک کہ بت پرستی کو بھی ایک طبقے میں رواج مل گیا۔ مرور زمانہ سے یہ قوم بتدریج فنا ہوتی چلی گئی، حضرت عیسیؑ کے زمانے میں ان کے سابقہ دارالسلطنت کی نسبت سے انکو سامری کہا جاتا تھا، یہ قوم آج بھی نہایت قلیل تعداد میں موجود ہے، اور توریت پر عمل پیرا ہونے کی دعویدار بھی ہے۔

سورہ الحج کے آغاز میں جو پہلا گروہ بیان ہوا تھا، وہ مشرکین کا تھا، جبکہ دوسرے کا ذکر جب ہوا تو خسرو پرویز بطور نمائندہ زیر بحث آیا۔ تیسرا گروہ اہل کتاب کا تھا جو کہ کنارے پر رہ کر اللہ کی عبادت کر ہی رہے تھے، ان مین نمائدگی مدینہ کے یہود کو دی گئی اور ان سے بالواسطہ خطاب بھی ہوا۔ آیت ١٦ پر تیسرے گروہ کا ذکر ختم ہوا۔ اور اب مجموعی بحث کا آغاز ہو رہا ہے۔ سب سے پہلے ایمان لانے والے گروہ کا ذکر ہے، یعنی کہ مسلمان۔ لیکن یہاں یہ دھیان رہے کہ دیگر گروہ بالخصوص وہ جو یہودی ہوئے، اور وہ جو صابی تھے، دونوں ہی توحید پر ایمان رکھتے تھے، نصاری بھی تثلیث کے باوجود توحید کے ہی دعویدار ہیں، اور نبی کریمؐ کے زمانے میں تو موحد عیسائی بھی بڑی تعداد میں تھے۔ فلسفیانہ تاویلات کے بعد مجوس بھی وحدانیت کے ہی قائل ہیں۔ مشرکین بھی یہ تو مانتے تھے کہ ایک اللہ ہے لیکن اس کے ساتھ سینکڑوں دیگر خداؤں کو بھی مانتے تھے۔ لہذا جب ان الذین امنوا کا لفظ ان مذاہب بالخصوص یہود کے مقابلہ میں آئے گا، تو وجہ تفریق محض ایمان باللہ نہیں بلکہ ایمان بالرسالت اور ایمان بالقران بھی ہوگی۔ اس تقریر کا محور ہی علم، کتاب وحی اور صاحب وحی ہیں۔ آیت میں ان تمام گروہوں کے درمیان روز قیامت فیصلہ کردینے کا ذکر کیا گیا ہے۔

آیت ١٨ میں بیان ہے کہ آسمان والے یعنی فرشتے بھی اللہ کے اگے سجدہ ریز ہیں، اور زمین والے یعنی مومنین صادقین بھی اللہ کے اگے سجدہ ریز ہیں، اور زمین و آسمان کی تمام غیر مکلف جاندار و بے جان مخلوق بھی اللہ کے اگے سجدہ ریز یا اسکے حکم کے تابع ہے۔ اس کے بعد بہت سے انسانوں کے سجدہ کرنے کا ذکر ہوا ہے۔ سورت کے آغاز سے ہی جب مختلف گروہوں کا ذکر ہو رہا تھا، تو وہاں الناس سے غیر مسلم گروہ ہی مراد تھے، ومن الناس (لوگوں میں سے کئی) سے آیت کا آغاز ٣ کا آغاز ہوا ، پھر آیت ٨ میں اور پھر ١١ میں یہی الفاظ شروع میں تھے، اور کبھی ان سے مشرک مراد رہے تو کبھی مجوس تو کبھی اہل کتاب۔ آیت ١٧ میں مسلمانوں کے مقابلے میں انکا فرداً فرداً ذکر ہوا اور اب آیت ١٨ میں ان تمام گروہوں کو الناس میں جمع کرکے بیان کیا گیا ہے کہ ان غیر مسلم لوگوں میں سے بھی تو کئی اللہ کے آگے سجدہ ریز ہی ہیں ، باقی بہت سے ان میں سے ایسے بھی ہیں جو اب عذاب کے مستحق ہوچکے ہیں۔ ظاہر ہی بات ہے کہ جو لوگ اللہ کے اگے سجدہ ریز ہونے والی قوموں میں سے ہوں اور پھر بھی عذاب کی مستحق ٹھہرے ہوں، تو بنیادی فرق رسول ﷺ اور اس کتاب قران پر بھی ایمان لانے کا ہوا۔

آیت ١٩ تا ٢٤ کا بیان:

هَٰذَانِ خَصۡمَانِ ٱخۡتَصَمُواْ فِي رَبِّهِمۡۖ فَٱلَّذِينَ كَفَرُواْ قُطِّعَتۡ لَهُمۡ ثِيَابٞ مِّن نَّارٖ يُصَبُّ مِن فَوۡقِ رُءُوسِهِمُ ٱلۡحَمِيمُ (١٩) يُصۡهَرُ بِهِۦ مَا فِي بُطُونِهِمۡ وَٱلۡجُلُودُ (٢٠) وَلَهُم مَّقَٰمِعُ مِنۡ حَدِيدٖ (٢١) كُلَّمَآ أَرَادُوٓاْ أَن يَخۡرُجُواْ مِنۡهَا مِنۡ غَمٍّ أُعِيدُواْ فِيهَا وَذُوقُواْ عَذَابَ ٱلۡحَرِيقِ (٢٢) إِنَّ ٱللَّهَ يُدۡخِلُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ جَنَّٰتٖ تَجۡرِي مِن تَحۡتِهَا ٱلۡأَنۡهَٰرُ يُحَلَّوۡنَ فِيهَا مِنۡ أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٖ وَلُؤۡلُؤٗاۖ وَلِبَاسُهُمۡ فِيهَا حَرِيرٞ (٢٣) وَهُدُوٓاْ إِلَى ٱلطَّيِّبِ مِنَ ٱلۡقَوۡلِ وَهُدُوٓاْ إِلَىٰ صِرَٰطِ ٱلۡحَمِيدِ (٢٤)

"یہ دو فریق ہیں جو اپنے رب کے معاملہ میں جھگڑتے ہیں پھر جو منکر ہیں ان کے لیے آگ کے کپڑے قطع کیے گئے ہیں اور ان کےسروں پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا (١٩) جس سے جو کچھ ان

کے پیٹ میں ہے اور کھالیں جھلس دی جائیں گی (۲۰) اور ان پر لوہے کے گرز پڑیں گے (۲۱) جب گھبرا کر وہاں سے نکلنا چاہیں گے اسی میں لوٹا دیئے جائیں گے اور دوزخ کا عذاب چکھتے رہو (۲۲) بے شک اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہاں انہیں سونے کے کنگن اور موتی پہنائیں جائیں گے اور وہاں ان کا لباس ریشمی ہوگا (۲۳) اور انہوں نے عمدہ قول کی راہ پائی اور تعریف والے اللہ کی راہ پائی (۲٤)"

یہاں دراصل آیت ۱۸ میں بیان کردہ دو فریقوں کی بات ہورہی ہے، ایک تو وہ جو زمین والے سجدہ گزار ہیں، یعنی کہ مومنین، اور دوسرا گروہ الناس کا ہے کہ جس کے اندر اہل کتاب و غیر اہل کتاب مذہبی گروہ اور مشرکین سب شامل ہیں۔ امام حجت کے بعد ان گروہوں میں سے جو فرد بھی ایمان نہ لایا اس کے اخروی عذاب کا بیان آیت ۲۲ تک بیان ہوا ہے اور جو ایمان لے آیا اس کے لئے اخروی نعمتوں کا بیان آیت ۲۳ میں کیا گیا ہے۔ اور آیت ۲۴مین بیان ہوا کہ یہ اس لیے ہوگا کہ انہوں نے عمدہ قول (قران مجید) اور تعریف والے اللہ کی راہ پالی۔ یہ اس سلسلہ تقریر کی آخری آیت ہے۔ اس تقریر کا محور ایمان بالقران ہی ہے۔ اور اب اختتامی آیت مین بھی قران کریم کے حوالے سے ہی جو اللہ کی راہ پکڑیں گے، وہی جنت کے مستحق ٹھہریں گے اگرچہ یہود اور کئی دیگر گروہ ایک اللہ کی عبادت کے دعویدار ہیں۔ قران میں اس مقام کے علاوہ بھی خود قران کے لیے قول کا لفظ استعمال ہوا ہے، مثلاً سورہ الطارق کی آیت ۱۳میں قران کریم کے لیے انہ لقول فصل استعمال ہوا ہے، اسی طرح سورہ القصص کی آیت ۵۱ میں کتاب الہی کے لیے ولقد وصلنا لھم القول لعلھم یتذکرون استعمال ہوا ہے۔

سور الحج کی ان آیات کو خالی الذہن ہوکر پڑھا جائے، اور ان آیات میں موجود اشاروں سے ہی مضمون کا اصل مدعا دیکھا جائے نہ کہ باہم متضاد شان نزولوں کے ذریعے، تو کوئی غیر جانبدار شخص یہ نہیں مانے گا کہ یہ آیتیں دس پندرہ سالوں میں بلا کسی ربط کے آگے پیچھے بس یونہی نازل ہوتی رہیں، جن کو نبی پاک ﷺ نے آخری دنوں میں سمیٹ کر ایک سورت کا روپ دیدیا، یا ایک قدم اور آگے بڑھ کر بات کی جائے کہ صحابہ کرامؓ نے اپنے صوابدید پر ان کو جیسے چاہا سورتوں میں ڈھال دیا۔ آیت ۱۸ کے سلسلے میں بھی ایک شان نزول بیان کی جاتی ہے، یہ بھی انہی شان نزولوں مین سے ہے، جس نے ایک مکی دور کی سورت کو مدینہ پہنچادیا۔ اس شان نزول نے تو اتنی شہرت پائی کہ بہت سے وہ لوگ جو سورہ الحج کو مکی مانتے تھے، آیت ۱۸ اور اسکے بعد کی چند آیات کو استثنٰی دیدیتے تھے۔

ابومجلز راوی کا بیان ہے کہ انہیں قیس بن عباد نے بیان کیا کہ حضرت ابوذر غفاریؓ قسم کھا کر بیان کرتے تھے کہ یہ آیت "یہ دو فریق ہیں، جنہوں نے اپنے رب کے بارے میں جھگڑا کیا" حمزہؓ اور انکے دو ساتھیوں (حضرت علیؓ اور حضرت عبیدہؓ بن حارث) اور عتبہ اور اسکے دو ساتھیوں (شیبہ اور ولید بن عتبہ) کے بارے مین نازل ہوئی تھی، جب انہوں نے بدر کی لڑائی میں میدان میں آکر مقابلہ کی دعوت دی تھی (صحیح بخاری، کتاب التفسیر)

راوی ابو مجلز کے مطابق حضرت ابوذر غفاریؓ نے قسم کھا کر یہ بیان دیا تھا، لیکن حضرت ابوذر غفاریؓ تو نہ غزوہ بدر میں شامل تھے اور نہ ہی غزوہ احد میں۔ لہذا وہ تو اس روایت کےاولین راوی ہو نہیں سکتے تھے۔ آخر انہوں نے اس روایت کو کس صحابی سے سن کر قیس بن عباد کو قسم کھا کر بیان کیا تھا۔ دوسری جانب صحیح بخاری ہی کی کتاب المغازی کے مطابق حضرت علیؓ خود بھی یہی بات قیس بن عباد کو بتاچکے تھے۔

صحیح بخاری ہی کی کتاب المغازی میں ابو مجلز قیس بن عباد کے حوالے سے بیان کرتا ہے کہ حضرت علیؓ نے کہا یہ آیت "یہ دو فریق ہیں، جنہوں نے اپنے رب کے بارے میں جھگڑا کیا" ہمارے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ (صحیح بخاری، کتاب المغازی)

ابو مجلز عن قیس بن عباد کے کی یہ روایت حضرت علیؓ کے حوالے سے صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں یوں بیان ہوئی ہے کہ حضرت علیؓ نے کہا کہ میں قیامت کے دن سب سے پہلا شخص ہونگا جو رحمن کے سامنے جھگڑے (یعنی مقدمہ) کے لیے گھٹنوں کے بل نیم استادہ ہوگا۔ قیس بن عباد نے کہا کہ یہ آیت "یہ دو فریق ہیں، جنھوں نے اپنے رب کے بارے میں جھگڑا کیا" ان چھ اشخاص کے بارے مین نازل ہوئی ہے جو بدر کے دن (عمومی لڑائی سے پہلے) ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے۔ مسلمانوں میں سے حمزہؓ، علیؓ اور عبیدہؓ یا ابوعبیدہ، اور مشرکین مین سے شیبہ، عتبہ اور ولید بن عتبہ (صحیح بخاری کتاب التفسیر)

سوال یہ ہے کہ جب ازروئے روایت صاحب معاملہ حضرت علیؓ بذات خود یہی بات قیس بن عباد کو گوش گزار کرچکے تھے، تو کسی دوسرے کے قسمیہ بیان کی حاجت رہ ہی کیا رہ جاتی تھی کہ اسکے حوالے اگلی نسلوں کو دیے جاتے۔

ابو مجلز کی یہی روایت قیس بن عباد ہی کی سند کے ساتھ صحیح مسلم میں بھی موجود ہے۔ گویا یہ ان روایات میں سے ہے جن پر بخاریؒ اور مسلمؒ دونوں متفق ہیں۔ یعنی دو مختلف صحابیوںؓ نے صرف قیس بن عباد کو بیان کیا اور اس نے بھی محض ابو مجلز ہی کو بتانے پر اکتفا کیا۔ حیرت کا مقام ہے۔

یہ روایات بھی ان روایات میں سے ہیں جنھوں نے سورہ الحج کو اس کے اصل مقام مکی دور سے نکال کر مدنی دور میں پہنچا دیا ہے. مزید یہ کہ قران مجید کے مبین کلام کو مبہم بنانے میں اسکا اور اسی جیسی دوسری روایات کا پورا پورا ھاتھ ہے۔ آیت کو پڑھا جائے تو اس سے تو کسی درجہ میں بھی یہ تاثر نہیں ابھرتا کہ یہ غزوہ بدر یا کسی غزوہ کے بعد نازل ہوئی ہے، اور اگر بالفرض ہوئی بھی ہے، تو اس سے یہ تاثر بھی نہیں ابھرتا کہ دونوں متحارب گروہوں کے صرف منتخب افراد ہی اس آیت کا وجہ نزول بنے ہیں۔ سورہ حج وہ پہلی سورت ہے کہ جس میں جہاد کی مشروط اجازت آیت ۳۹ میں دی گئی ہے، یہ کیسی بات ہے کہ جہاد کی اجازت کی آیت تو بعد میں آرہی ہو، اور جہاد ہوجانے کے بعد کچھ شریک جنگ افراد کے متعلق آیت پہلے بیان کردی جائے۔ مزید یہ کہ غزوہ بدر کے نتائج پر قران کریم میں پوری ایک سورت سورہ انفال موجود ہے، اگر واقعتاً ابومجلز ہی کی بات درست ہوتی، تو اس آیت کو سورہ انفال کا حصہ ہونا چاہیے تھا نہ کہ سورہ الحج کا۔ آیت کو غور سے پڑھا جائے تو اس میں ضمائر یا پروناؤنز میں بات ہوئی ہے، اور ضمائر میں بات تب کی جاتی ہے کہ وہ ضمیریں پچھلے کلام کی طرف پھر رہی ہوں، یا موضوع کے مرکزی مضمون کی طرف بصورت دیگر وہ اتنی واضح ہوں کہ پڑھنے والے یا سننے والے کا ذہن خود بخود حقیقی مراد تک پہنچ جائے خواہ اسکا ذکر اس سے پہلے کلام میں آیا ہو یا نہیں۔ یہ روایت تو ان میں سے کوئی ایک شرط بھی پوری نہیں کرتی ہے، خود ابو مجلز کا دعوی ہے کہ حضرت ابو ذر غفاریؓ کو قسم کھا کر یقین دلانا پڑا تھا کہ یہاں مراد حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ یا عتبہ شیبہ ہیں۔ گویا یہ ضمیریں اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے پچھلی آیات یا مرکزی مضمون کی طرف پھرنے کی بجائے قرآن سے باہر کسی روایت کی محتاج بن گئی ہیں۔ اور اس کا مطلب یہ ہو جاتا ہے کہ قرآن مبین کلام نہیں رہا بلکہ ایک ضمیمے کا محتاج ہو گیا ہے. ابو مجلز کی اس روایت یا اس نوعیت کی دوسری روایتوں نے مسلمان امت کے ذہن میں یہ تاثر پیدا کر دیا ہے کہ سورت کی آیات میں کوئی باہمی ربط نہیں ہوتا،اور قران ایک منتشر کلام ہے، اور ان روایات کے دفاع نے اس تاثر کو مزید گہرا کردیا ہے۔

باوجود اس کے کہ یہ روایت صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہے، مولانا مودودیؒ نے اس کا کھلے لفظوں میں انکار کر دیا ہے. فرماتے ہیں "اس آیت کے متعلق بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت مدنی ہے لیکن اس قول کی بنیاد صرف یہ ہے تو ان کے نزدیک ان دو فریقوں سے مراد جنگ بدر کے فریقین ہیں اور یہ کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے. سیاق و سباق میں کوئی چیز ایسی نہیں پائی جاتی جو اس اشارے کو اس جنگ کے فریقین کی طرف پھیرتی ہو. الفاظ عام اور سیاق عبارت

صاف بتا رہا ہے کہ اس سے مراد کفر و ایمان کی اس نزاع عام کے فریقین ہیں جو ابتدا سے چلی آ رہی ہے اور قیامت تک جاری رہے گی. جنگ بدر کے فریقین سے اس کا تعلق ہوتا تو اس کی جگہ سورہ انفال میں تھی نہ کہ اس سورے میں اور اس سلسلہ کلام میں. یہ طریقہ تفسیر اگر صحیح مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ قران کی آیات بالکل منتشر طریقہ پر نازل ہویئں اور پھر ان کو بلا کسی ربط و مناسبت کے بس یوں ہی جہاں چاہا لگا دیا گیا. حالانکہ قرآن کا نظم کلام خود اس نظریے سب سے بڑی تردید ہے".

واضح رہے کہ مولانا مودودیؒ یہ بات صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی متفق علیہ روایت کے بارے میں کہہ رہے ہیں. مولانا مودودیؒ نے تفہیم القران میں اس نوعیت کی کئی روایتوں کو صراحتاً اور کنایتاً مسترد کیا ہے کہ جو نظم کلام کو پوری طرح توڑ رہی تھیں، چاہے وہ بہت اعلیٰ درجہ کی کتب کی روایات ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی وجہ سے بعض روایت پرستوں نے ان کو منکر حدیث تک کہہ دیا تھا۔
اس روایت کے متن کو اگر ایک طرف رکھیں تو بھی اس کی سند کوئی بہت اعلیٰ درجہ کی نہیں ہے. اگرچہ وہ راوی جو بخاریؒ اور مسلمؒ میں راہ پا چکے ہیں ان کے لیے دستور یہ بنادیا گیا ہے کہ جرح ہی نہ کی جائے یا پھر انتہائی نرم الفاظ میں کی جائے تاکہ روایت کا پورے طور دفاع ہو سکے، خواہ اس سے قران کا بیان تہس نہس ہی کیوں نہ ہوجائے۔ لیکن اس کے باوجود بھی یحییٰ بن معین کی ابو مجلز کے متعلق یہ جرح مل جاتی ہے کہ ابو مجلز مضطرب الحدیث تھا. ابو داؤد الطیالسی شعبہ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ ہمیں اسکے بارے میں خبریں پہنچی کہ یہ شخص شیعہ تھا اور یہ بھی کہ یہ شخص عثمانی تھا. اب چاہے یہ عثمانی ہو یا شیعہ یا ان میں سے کچھ بھی نہ ہو، لیکن اس سے یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی بیٹھک ان نظریات کے لوگوں کے سنگ ضرور تھی اور اس کی یہی روایت اس کا بین ثبوت ہے. سلسلہ کلام سے توڑ کر ایک جانب ایک مکی آیت کو غزوہ بدر سے جوڑ تو دیا لیکن اس مخاصمت کو بھی بدر کے تمام مسلمانوں اور مشرکوں کی بجائے بنو ہاشم سے تعلق رکھنے والے تین صحابہؓ اور بنو امیہ سے تعلق رکھنے والے تین مشرکین سے ہی متعلق کردیا جو کہ عام مقابلے سے پہلے لڑے تھے. ابو مجلز کا زمانہ وہ دور تھا جب بنو امیہ اقتدار میں تھے اور بنو ہاشم کے علوی اور عباسی خاندان اقتدار حاصل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے. ریاست کے خلاف لوگوں کی ذہن سازی کے لئے قرآن کریم اور رسول اللہ ﷺ سے منسوب سچے جھوٹے حوالے ایک بہترن ہتھیار ثابت ہو سکتے تھے۔ سوچنے کی بات ہے کہ اگر یہ آیت بدر کے موقع پر ہی نازل ہوئی ہوتی تو کیا رسول اللہ ﷺ اس کے سب سے پہلے حقدار نہ ہوتے اور دوسری جانب ابو جہل جس کے ایما پر یہ ساری جنگ وقوع پذیر ہوئی تھی تو یہ روایت اس کی بھی کوئی مذمت نہیں کرتی. بلکہ جن تین افراد کو چنا گیا وہ نہ صرف بنو امیہ کے افراد تھے بلکہ ان میں سے ایک حضرت امیر معاویہؓ کا نانا دوسرا ماموں اور تیسرا نانا کا بھائی تھا. شان نزول کی روایت تو صاف بتا رہی ہے کہ جس مذمت کا حقدار ابو جہل نہ ہو بلکہ اس ہی کی معیت میں لڑنے والے تین دیگر افراد ہوں تو اس کا مطلب ان تین افراد کا بنیادی جرم غزوہ بدر میں مسلمانوں کا مقابلہ کرنا نہیں بلکہ حضرت امیر معاویہؓ کا رشتہ دار ہونا ہے. ابو مجلز نے یہ روایت ضرور کسی شیعہ سے سنی ہو گی اور مضطرب الحدیث ہونے کے ناطے قیس بن عباد کے سر منڈھ دی. بعد میں جب یہ صحیحین کی زینت بن گئی تو گویا اب ہمارے ایمانیات کا حصہ بن گئی، انا للہ وانا الیہ راجعون

حاصل کلام:

سورہ الحج کی ان آیات کا آج کے مسلم معاشرے سے پورا پورا تعلق ہے، کیونکہ ہماری اکثریت بھی اس وقت بالکل اسی ڈگر پر پہنچ چکی ہے کہ جس وقت بعثت نبوی ﷺ کے زمانے کا دنیاوی معاشرہ تھا. ہماری عوام کی اکثریت تو قران کو عرصہ دراز ہوا خود ہی تیاگ چکی ہے، اور جب ہدایت کا

اصل منبع ہاتھوں سے نکل جائے، تو وہی صورت حال پیش آتی ہے کہ جو آیت ۳ میں پیش کی گئی ہے کہ ہر شیطان کی پیروی کرنے لگتے ہیں- دوسرا گروہ وہ ہے کہ جو بالعموم دانشوران پر مشتمل ہے، دنیا جہان کے نظریات کو آگے بڑھانے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں- اور یہ نظریات محض دینی نہیں ہوتے بلکہ سماجی، سیاسی ، معاشی ثقافتی، ہر پہلو سے متعلق ہیں- جب ایک طبقہ معاشرے میں علمی و ذہنی سطح پر باقی افراد سے اوپر ہوتا ہے، تو اسکی ذمہ داری بھی دوچند ہوتی ہے- اللہ تعالی نے قران کو فرقان قرار دیا ہے، تو یہ فرقان دنیا کے ہر اس عکم سے متعلق ہے کہ جس سے ہمارا معاشرہ اثر انداز ہوتا ہے- قران کے بتائے ہوئے اصولوں کے تابع رہتے ہوئے یہ طبقہ اپنا کام کرے تو بہترین کردار ادا کرسکتا ہے، اور اگر قران کو پس پشت ڈال کر اس کے مخالف نظریات کا پرچار کریگا، تو اسکا انجام بھی وہی ہوگا، جو اللہ نے آیت ۸ تا ۱۰ مین بیان کیا ہے- تیسرا گروہ وہ ہے کہ جس سے ہماری مذہبی عوام کا تعلق ہے خواہ کسی بھی مسلک سے تعلق رکھتے ہوں، جہاں تک مسلک کے مطابق دین سمجھ آتا ہے اسکو قبول کر لیتے ہیں، اور جونہی قران مروجہ اسی کے خلاف بات کر رہا ہوتا ہے، تو پھر ناسخ منسوخ کی بحثیں شروع کرکے قران کو معطل کیا جاتا ہے- ایسے ہی طبقہ کے متعلق بیان ہوا ہے کہ پھر وہ ایسی چیزوں کو پوجتے ہیں کہ جو نہ فائدہ پہنچا سکتی ہیں، نہ نقصان مثلاً آستانے، چوکھٹیں، قبریں، یہاں تک کہ ایک طبقہ تو گھوڑوں تک کو پوج رہا ہوتا ہے- ان ہی میں سے ایک طبقہ وہ ہوتا ہے، کہ جب قران ان کے خلاف جارہا ہوتا ہے، تو اپنے علماء کو پکارتے ہیں، وہ قران کی ایسی تاویل کرکے بیان کردیتے ہین کہ مسلک بھی ہاتھ سے نہ جائے، اور خود پر بھی الزام نہ پڑے، ایسے طبقے کو کہا گیا ہے کہ ان کا نقصان ان کے فائدہ سے بہت زیادہ ہے-اللہ سے دعا ہے کہ ہم کو اس طبقہ میں سے اٹھا کہ جس نے عمدہ قول یعنی قران مجید کی راہ پائی اور تعریف والے اللہ کی راہ پاگئے

مزید سوچنے کی بات یہ ہے کہ آیت ۱۱ میں جو فرمایا جاتا ہے کہ لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جو کنارے پر عبادت کرتا ہے. آخر اس کا مطلب کیا ہوا؟ یہ کس چیز کے کنارے کی بات ہو رہی ہے؟ کہیں یہ تو نہیں کہا جا رہا ہے کہ دین سماجی، معاشرتی، معاشی اصولوں کا وہ سمندر ہے جس میں اترنا ہے، جہاں حق اور مفادات کا ٹکراؤ ہوتا ہے، جہاں سچ اور رشتے آمنے سامنے ہوتے ہیں، جہاں لوگ کیا کہیں گے اور اللہ کیا کہتا ہے کی تکرار ہوتی ہے اور عبادت تو انسان کو بس طاقت دیتی ہے اس سمندر میں اترنے کے لئے. لیکن ہم نے عبادت کو دین سمجھ لیا ہے اور اگر ہم دین میں آگے جانا چاہتے ہیں تو دنیا سے کٹ جاتے ہیں اور عبادت میں ہی بس مصروف رہتے ہیں، جب کہ اللہ تو کہہ رہا ہے کہ اٹھو اور اس دنیا کو بدلو اور اس کے لئے کوشش اور جدوجہد کرو. اور اگر صرف عبادت میں ہی مصروف رہو گے تو تم صرف دین کے کنارے پر ہی کھڑے ہو.

آیت ۲۵ کا بیان:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِي جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ ۚ وَمَنْ يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ (۲۵)

جن لوگوں نے کفر کیا اور جو (آج) اللہ کے راستے سے روک رہے ہیں اور اُس مسجدِ حرام کی زیارت میں مانع ہیں جسے ہم نے سب لوگوں کے لیے بنایا ہے، جس میں مقامی باشندوں اور باہر سے آنے والوں کے حقوق برابر ہیں (اُن کی روش یقیناً سزا کی مستحق ہے) اِس (مسجدِ حرام) میں جو بھی راستی سے ہٹ کر ظلم کا طریقہ اختیار کرے، اسے ہم درد ناک عذاب کا مزا چکھائیں گے (۲۵)

یہاں سے سورت کے ابتداء میں بیان کے گئے تین گروہوں میں سے پہلے گروہ یعنی مشرکین مکہ کی طرف خطاب موڑا جا رہا ہے کہ جب انہوں نے عبادت کے لیے باہر سے آنے والوں پر زمین تنگ کی تھی. عام طور پر اس آیت کو صلح حدیبیہ کے وقت سے جوڑ دیا جاتا ہے کیونکہ آج کی تاریخ

میں روکے جانے کا معروف ترین واقعہ وہی ہے جیسا کہ تفسیر ماجدی میں مولانا عبدلمالک دریا آبادی فرماتے ہیں "٦ ہجری میں جب رسول اللہ نے ایک جماعت کثیر کے ساتھ مدینہ سے عمرہ کا قصد کیا تھا تو مشرکین مکہ نے آپ کو مقام حدیبیہ پر آ کر آگے بڑھنے سے روک دیا تھا. اشارہ اسی طرف ہے." تفسیر کلبی (المعروف تفسیر ابن عباس) میں اس آیت کی شان نزول یہ بیان ہوئی ہے ابو سفیان اور ان کے ساتھ لوگوں کو دین خداوندی اور اطاعت خداوندی سے روکتے ہیں یعنی ابو سفیان وغیرہ جو اس وقت تک مشرف با اسلام نہ ہوئے تھے اور لوگوں کو خدا کی راہ سے، سچے دین سے اور مسجد حرام سے روکتے تھے.... جو شخص وہاں ظلم کا ارادہ کرتا ہے اور لوگوں کو ستاتا ہے ہم اسے دردناک عذاب دیں گے"۔ گویا تفسیر کلبی نہ صرف اس آیت کو صلح حدیبیہ سے متصف کر رہی ہے بلکہ حضرت ابو سفیانؓ کا نام لے کر انؓ کے لئے دردناک عذاب کی بات کررہی ہے۔ حالانکہ اگر سورہ فتح کا مطالعہ کیا جائے، جو کہ حقیقتاً حدیبیہ ہی کے بعد نازل ہوئی، وہاں روکنے والوں پر مشروط دنیاوی عذاب کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: "یہ کافر لوگ اگر اِس (حدیبیہ کے) وقت تم سے لڑ گئے ہوتے تو یقیناً پیٹھ پھیر جاتے اور کوئی حامی و مددگار نہ پاتے (٢٢) یہ اللہ کی سنت ہے جو پہلے سے چلی آ رہی ہے اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے (٢٣) وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں اُن کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ اُن سے روک دیے، حالانکہ وہ اُن پر تمہیں غلبہ عطا کر چکا تھا اور جو کچھ تم کر رہے تھے اللہ اسے دیکھ رہا تھا (٢٤) وہی لوگ تو ہیں جنہوں نے کفر کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا اور ہدی کے اونٹوں کو اُن کی قربانی کی جگہ نہ پہنچنے دیا اگر (مکہ میں) ایسے مومن مرد و عورت موجود نہ ہوتے جنہیں تم نہیں جانتے، اور یہ خطرہ نہ ہوتا کہ نادانستگی میں تم انہیں پامال کر دو گے اور اس سے تم پر حرف آئے گا (تو جنگ نہ روکی جاتی روکی وہ اس لیے گئی) تاکہ اللہ اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل کر لے وہ مومن الگ ہو گئے ہوتے تو (اہل مکہ میں سے) جو کافر تھے ان کو ہم ضرور سخت سزا دیتے (٢٥)"(سورہ فتح ٢٢-٢٥)

یعنی سورہ حج کے برخلاف سورہ فتح کے مطابق اس وقت (٦ ہجری) کے مشرکین مکہ نے لازماً عذاب کا ذکر نہیں ہورہا، بلکہ عذاب کے حوالے سے ایک شرط سے تو انہوں نے خود بھی رجوع کر لیا تھا کیونکہ اس موقعہ پر انہوں نے اگلے سال (٧ ہجری) میں مسلمانوں کو حرم آنے کی اجازت بھی دے دی گئی تھی اور پھر اسکے اگلے سال (٨ ہجری) میں وہ لوگ بحثیت مجموعی مسلمان بھی ہو گئے تھے، گویا سورہ حج میں جس لازمی عذاب کا ذکر ہے، اس کا شکار ٦ہجری کے بعد کے مشرکین مکہ بالکل نہیں ہوئے ہیں۔ ایک اہم بات یہ کہ جب کلبی حدیبیہ کے موقع پر مشرکین پر عذاب کا ذکر کرتے ہیں، تو عمومی بیان میں بھی جناب ابو سفیانؓ کا نام خصوصی طور پر لیتے ہیں، گویا انکی روایت کا مطمع نظر جناب ابو سفیان پر چوٹ کرنا تھا۔ ایک صحابیؓ رسولؐ پر تبرا کرنے کا دروازہ ایسی ہی پروپیگنڈا شان نزولوں نے کھولا ہے۔ حضرت ابو سفیانؓ، حضرت امیر معاویہؓ کے والد تھے، جب کہ تفسیر ابن عباسؓ کا مصنف کلبی شیعہ تھے۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سیاسی مقاصد کے لئے قرآن کو کس طرح ڈھال بنایا جاتا تھا۔

اگر سورہ حج کی یہ آیت (٢٥) بھی صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوئی ہوتی تو کیا یہ سورہ فتح سے تضاد نہ کہا جاتی؟ اس آیت کو صلح حدیبیہ کے موقعہ پر نازل شدہ ماننے سے فقہاء میں بھی بہت اختلاف پیدا ہو گیا کہ آیت (٢٥)آخر کس چیز میں مقامیوں اور باہر والوں کے حقوق برابر بیان کر ہی ہے، کیونکہ حدیبیہ عین حدود حرم سے باہر ہے لہٰذا فقہا کی ایک جماعت نے پورے حدود حرم کو مسجد حرام کا قائم مقام مانا کیونکہ حدیبیہ کے موقعہ پر داخل تو حدود حرم میں ہی نہیں ہونے دیا گیا تھا۔ اب اگر حدود حرم کو ہی مسجد حرام مان لیا گیا تو لازماً سوال اٹھنا تھا کہ اتنے بڑے علاقے میں میں مقامیوں اور باہر والوں کے حقوق کن کن حیثیتوں میں برابر ہیں؟ اور جب تمام زمین پر ہی ہر

حیثیت میں برابر کا حق سمجھ لیا گیا تو یہاں تک کا فتویٰ آیا کہ حدود حرم کا کوئی مکان کسی کی ملکیت ہے ہی نہیں اور کوئی بھی باہر والا کسی کے بھی مقامی کے گھر بلا اجازت جا کر ٹھہر سکتا ہے۔ ظاہر ہے اس نوعیت کے انتہائی فتاویٰ اسی پس منظر کو ذہن میں بنیادی نکتہ رکھتے ہوئے ہوئے دیے گئے کہ یہ آیت ضرور صلح حدیبیہ کے موقعہ پر نازل ہوئی ہوئی تھی۔ حالانکہ سورت کا نظم بھی اس بات کی شدید ترین نفی کر رہا ہے کہ یہ سورت ہجرت کے بھی اتنا عرصہ بعد نازل ہوئی ہو کیونکہ سورہ حج وہ اولین سورت ہے کہ جس میں پہلی بار جہاد کی اجازت دی گئی ہے (آیت ۳۹)، جب کہ صلح حدیبیہ سے پہلے متعدد جہاد (بدر، احد، خندق وغیرہ) ہو چکے تھے، اور صلح حدیبیہ کے بعد مشرکین مکہ، کہ جنہوں نے حرم کا راستہ روکا تھا، ان سے کوئی جہاد نہیں ہوا ہے۔امام شافعیؒ نے اس آیت (۲۵) میں مقامیوں اور باہریوں کے برابری کے حقوق سے مراد مسجد حرام یا حدود حرم اور اس سے متصل ان مقامات سے لی ہے کہ جہاں مسلمان عبادت کے لئے مکہ آتے ہیں، یعنی کہ حج اور عمرہ کے مقامات۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر اس آیت (۲۵) میں حدیبیہ کا ذکر نہیں تو پھر کس حوالے سے بات ہورہی ہے۔ سورہ حج کی اس آیت کو صلح حدیبیہ کی بجائے اس کے اپنے دور نزول، یعنی ۱۲ نبوی کے حج کے بعد کے مطابق دیکھا جاتا تو بات وہی نکلتی ہے جو کہ امام شافعیؒ کہہ رہے ہیں۔

نبوت کے بارہویں سال کا حج اور مکہ والوں کا قانون ارضی سے انحراف:

اصل میں سورہ کی اس آیت (۲۵) کا مضمون ایک اہم واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ تمام عرب کے مسلمہ قانون کی رو سے چار مہینے حرمت کے تھے، جن میں سے رجب عمرہ کے لئے مخصوص تھا اور ذُوالقعدہ، ذُوالحجہ اور محرم کے مہینے حج سے متعلق تھے۔ اس تمام عرصہ میں نہ کسی سے لڑائی لڑی جاتی تھی اور نہ ہی راستوں میں لوٹ مار کی جاتی تھی اور اللہ کے گھر آنے والے جان و مال کی پامالی کے خوف کے بنا آجا سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ شروع میں جب کبھی نبی پاک نے حج کے موقع پر آنے والے غیر مقامیوں کو تبلیغ کی تو اہلیانِ مکہ نے سامعین کو زد و کوب نہیں کیا۔ سن ۱۰ نبوی میں مدینہ منورہ سے ٦ خزرجی جوان نبی پاک کے ہاتھ پر بیعت کر کے مسلمان ہو گئے۔ سن ۱۱ نبوی کے حج کے موقع پر ۱۲ افراد نے بیعت کی جس کو بیعت عقبہ اولیٰ کہتے ہیں۔ اس موقع پر نبی پاک نے حضرت مصعبؓ بن عمیر کو ان لوگوں کی تعلیم کے لیے انہیؓ کے ہمراہ مدینہ بھیج دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدینہ منورہ میں کئی افراد نے اسلام قبول کر لیا۔ ۱۲ نبوی کے حج کے موقع پر مدینہ منورہ سے جو قافلہ آیا اس میں سے ۷۲ افراد نے نبی پاک کے ہاتھ پر بیعت کی، اور یہ بیعت عقبہ ثانیہ کہلاتی ہے۔ یہ بعیت دوران حج منیٰ کی وادی میں ہوئی۔ اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کی بیعت کرنے کی اطلاع جونہی قریش کو ملی انھوں نے مدینہ سے آنے والے حجاج سے پوچھ تاجھ شروع کردی جس سے حجاج میں بد مزگی بھی پیدا ہوئی، اور جونہی یہ لوگ منیٰ سے روانہ ہوئے، مکہ والوں نے ان کی گرفتاری کی کوشش شروع کردی، اور نقیب حضرت سعدؓ بن عبادہ کو انہوں نے گرفتار بھی کر لیا اور سخت اذیتیں دیں۔ جبیر بن مطعم اور حرث بن امیہ نے مداخلت کر کے حضرت سعدؓ بن عبادہ کو رہائی دلوائی. اس تمام طرز عمل نے مدینہ والوں کے لیے آئندہ حرم آنا اپنی جان و مال کے حوالے سے پرخطر کر دیا تھا۔ اس پورے معاملے میں موقع، مکان اور زمان تینوں کی حرمتیں شدید پامال ہوئیں۔ حرمت کے مہینہ میں، حدود حرام میں عین حج کے موقع پر حجاج ہی کے ساتھ اس طرح کی جارحیت قانون ارضی کی شدید خلاف ورزی تھی۔ اور یہ قانون ارضی بھی دراصل حضرت ابراہیمؑ کے دور میں قانون سماوی تھا، جو کہ مرور زمانہ سے قانون ارضی میں بدل گیا تھا۔

آیت ۲۵ میں اللہ نے قریش کی اس قانون شکنی پر ان پر فرد جرم عائد کر دی ہے. اور بتا دیا گیا ہے کہ مسجد حرام کی حرمت کی پامالی پر ان کو دردناک عذاب کا مزہ چکھنا ہے۔

آیت ٢٦ تا ٢٩ کا بیان:

وَإِذۡ بَوَّأۡنَا لِإِبۡرَٰهِيمَ مَكَانَ ٱلۡبَيۡتِ أَن لَّا تُشۡرِكۡ بِي شَيۡـٔٗا وَطَهِّرۡ بَيۡتِيَ لِلطَّآئِفِينَ وَٱلۡقَآئِمِينَ وَٱلرُّكَّعِ ٱلسُّجُودِ (٢٦) وَأَذِّن فِي ٱلنَّاسِ بِٱلۡحَجِّ يَأۡتُوكَ رِجَالٗا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٖ يَأۡتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٖ (٢٧) لِّيَشۡهَدُواْ مَنَٰفِعَ لَهُمۡ وَيَذۡكُرُواْ ٱسۡمَ ٱللَّهِ فِيٓ أَيَّامٖ مَّعۡلُومَٰتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّنۢ بَهِيمَةِ ٱلۡأَنۡعَٰمِۖ فَكُلُواْ مِنۡهَا وَأَطۡعِمُواْ ٱلۡبَآئِسَ ٱلۡفَقِيرَ (٢٨) ثُمَّ لۡيَقۡضُواْ تَفَثَهُمۡ وَلۡيُوفُواْ نُذُورَهُمۡ وَلۡيَطَّوَّفُواْ بِٱلۡبَيۡتِ ٱلۡعَتِيقِ (٢٩)

"یاد کرو وہ وقت جب ہم نے ابراہیمؑ کے لیے اِس گھر (خانہ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی (اِس ہدایت کے ساتھ) کہ "میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو (٢٦) اور لوگوں کو حج کے لیے اذنِ عام دے دو کہ وہ تمہارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اور اونٹوں پر سوار آئیں (٢٧) تاکہ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں اُن کے لیے رکھے گئے ہیں اور چند مقرر دنوں میں اُن جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اُس نے انہیں بخشے ہیں، خود بھی کھائیں اور تنگ دست محتاج کو بھی دیں(٢٨) پھر اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں، اور اس قدیم گھر کا طواف کریں (٢٩)"

آیت ٢٥ میں بیان ہوا کہ اللہ کے گھر خانہ کعبہ کی برکات سے مقامی اور غیر مقامی سب یکساں حقدار تھے تاہم وہ لوگ جو اس کے رکھوالی پر متمکن تھے، انہوں نے مقامی ہونے کے باعث مسجد پر اپنا پشتینی حق جانتے ہوئے حج کے موقع پر باہر سے آنے والوں کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک روا رکھا۔ لہذا آیت ٢٦ کے آغازمیں ہی خانہ کعبہ کی تعمیر کی وجہ بیان ہوئی جس کا پہلا مقصد شرک سے بچنا اور ایک خدا پر ایمان رکھنا تھا جب کہ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ مشرکین مکہ جو کہ اس گھر کے متولی ہونے کے دعویدار تھے نہ صرف شرک میں ڈوبے ہوئے تھے بلکہ شرک کے دفاع میں بھی اس حد تک بڑھ چکے تھے کہ اب موحدین کے لیے اس گھر کے راستے بند کر رہے تھے حالانکہ ان کے کرنے کا تو یہ کام تھا کہ نہ صرف شرک سے دور رہتے بلکہ اس جگہ کے ماحول کو بھی طواف کرنے والوں اور نماز پڑھنے والوں کے لئے ہر طرح سے پاکیزہ رکھتے۔ اس طرف سے انھوں نے شدید غفلت برتی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے باہر سے آنے والوں پر اپنا امتیاز قائم رکھنے کے لیے اپنے واسطے حج کا طریقہ کار بھی بدل دیا تھا (سورہ بقرہ، آیت ١٩٩)؛ تاہم اب١٢نبوی کے حج کے بعد آخری حد میں بھی اپنے اس عہد سے انحراف کر بیٹھے تھے کہ جسکی وجہ سے وہ اب تک حرم کے مسند نشین رہے تھے، یعنی باہر (مدینہ) سے آنے والے حجاج کے لیے ہراسانی کا ماحول پیدا کردیا تھا اور انکو تشدد کا نشانہ بنانا شروع کردیا تھا۔ اب جب تمام ہی معاملات میں مکمل طور پر رو گردانی ہو چکی تھی، تو اس عذاب کا مزا چکھنا بھی ان پر لازم ہو چکا تھا، جس کے اشارے اس سے پہلے بھی متعدد مکی سورتوں میں دیے جاچکے تھے اور سورہ حج کی آیت ٢٥میں بھی اسکا حوالہ دیا گیا۔ یہ عذاب بدر کی جنگ (رمضان، ٢ ہجری) کی صورت میں ان پر نازل ہوا کہ جب وہ خود اپنی موت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رمضان ٨ ہجری میں مکہ فتح ہوا اور ٩ ہجری کے حج کے روز سورہ توبہ کا ابتدائی حصہ میدان عرفات میں تمام مسلم اور مشرک حجاج کو سنایا گیا کہ اب حرم پاک اسی ضابطہ کے مطابق ہوجائے گا، کہ جو صدیوں پہلے حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں اس کی اٹھان کے وقت طے ہوا تھا، کہ یہ عبادت گاہ شرک کے واسطے نہیں ہوگی۔ ارشاد ہوتا ہے:

"اے ایمان لانے والو، مشرکین ناپاک ہیں لہٰذا اس سال کے بعد یہ مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکنے پائیں --- (٢٨)" (سورہ توبہ، نزول ٩ ہجری)

اگلی آیات میں حج کی قربانی کا جب بیان ہوا تو واضح کردیا گیا کہ قربانی وہ ہوگی، کہ جس پر اللہ کا نام لیا جائے، غیر اللہ کے نام کی قربانی کہ جسکا عرب کے مشرک معاشرے میں رواج پاچکا تھا، اسکی نفی کی گئی ہے۔ مزید یہ بھی وضاحت کردی گئی کہ اس قربانی کا گوشت خود بھی کھایا جا سکتا ہے اورغریبوں میں بھی بانٹا جا سکتا ہے۔ دراصل سورہ حج کا نزول اس ماحول میں ہوا ہے کہ جب مدینہ میں ایک اسلامی ریاست قائم ہونے جارہی تھی، اور وہاں پہلے سے ایک حامل شریعت قوم یہود آباد تھے۔ اس بات کی تشریح اس موقع پراس لیے بھی ضروری تھی کہ مدینہ کے نو مسلموں پر شریعت محمدیؐ کے تحت قربانی کے اصول واضح ہوجائیں، کیونکہ جس موحد قوم کے ساتھ وہ لوگ اب تک رہتے آرہے تھے، ان کے یہاں قربانی کے اصول کچھ اور تھے۔

یہودی مذہب میں جانوروں کی قربانی کے تین طریقے تھے- سوختنی قربانی میں ذبح ہونے والے جانورکو مکمل طور پر جلا دیا جاتا تھا۔ اس قربانی کے گوشت کو کھایا نہیں جاتا تھا- ایک دوسرے طریقہ قربانی میں ذبح ہونے والے جانور کی چربی کو جلایا جاتا تھا جوکہ خدا کا حصہ سمجھا جاتا تھا- بقیہ پروہتوں کے حوالے کر دیا جاتا تھا- تیسری قسم میں کاہنوں کے ساتھ ساتھ صاحبِ قربانی اور اس کے متعلقین بھی مستفیذ ہوسکتے تھے- ان تینوں طریقہ کار میں مسکینوں اور محتاجوں کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ یہود کے یہاں یہ طریقے اللہ کی طرف سے تھے، یا پھر اس میں کچھ حصہ خود ساختہ بھی تھا، اس بات سے قطع نظر، یہود معاشرہ ان کو اپنی شریعت کا جزو مانتا تھا، اور ان پر قیاس کرتے ہوئے مدینہ کے نو مسلموں کے اذہان میں بھی قربانی کے متعلق اشکالات ممکن ہے اٹھے ہوں، لہذا اس وقت اسکی وضاحت بھی کردی گئی۔ اس کے بعد بعض دیگر ارکان کے انجام کے بعد طواف زیارت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ طواف حج کے فرائض میں سے ہے، جو کہ ۱۰تا ۱۲ ذوالحج کے درمیان کیا جانا ضروری ہے۔

آیت ۳۰ تا ۳۲ کا بیان:

ذَٰلِكَ وَمَن يُعَظِّمْ حُرُمَٰتِ ٱللَّهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُۥ عِندَ رَبِّهِۦۗ وَأُحِلَّتْ لَكُمُ ٱلْأَنْعَٰمُ إِلَّا مَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْۖ فَٱجْتَنِبُواْ ٱلرِّجْسَ مِنَ ٱلْأَوْثَٰنِ وَٱجْتَنِبُواْ قَوْلَ ٱلزُّورِ (۳۰) حُنَفَآءَ لِلَّهِ غَيْرَ مُشْرِكِينَ بِهِۦۚ وَمَن يُشْرِكْ بِٱللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ ٱلسَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ ٱلطَّيْرُ أَوْ تَهْوِى بِهِ ٱلرِّيحُ فِى مَكَانٍ سَحِيقٍ (۳۱) ذَٰلِكَ وَمَن يُعَظِّمْ شَعَٰٓئِرَ ٱللَّهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى ٱلْقُلُوبِ (۳۲)

"یہ تھا (تعمیر کعبہ کا مقصد) اور جو کوئی اللہ کی قائم کردہ حرمتوں کا احترام کرے تو یہ اس کے رب کے نزدیک خود اسی کے لیے بہتر ہے اور تمہارے لیے مویشی جانور حلال کیے گئے، ما سوا ان کے جو تمہیں پڑھ کر سنائے جاتے ہیں، پس بتوں کی گندگی سے بچو، جھوٹی باتوں سے پرہیز کرو (۳۰) یکسُو ہو کر اللہ کے بندے بنو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے تو گویا وہ آسمان سے گر گیا، اب یا تو اسے پرندے اُچک لے جائیں گے یا ہوا اُس کو ایسی جگہ لے جا کر پھینک دے گی جہاں اُس کے چیتھڑے اڑ جائیں گے (۳۱) یہ ہے اصل معاملہ (اسے سمجھ لو)، اور جو اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے (۳۲)"

آیت ۳۰ کا ابتدائی حصہ آیت ۲۵سے شروع ہونے والی اب تک کی تمام بات کو سمیٹتا ہے کہ جو بھی ان حرمتوں کو احترام کرے تو یہ اسکے لیے ہی اچھا ہے، پچھلی آیات (۲۹-۲۵) میں حج سے متعلق چند طریقہ کار بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس جگہ سے متعلق چند اور اہم باتوں کو بھی زیر بحث لایا گیا تھا، جن میں سے اولین تو یہ تھی کہ اسکو شرک سے بالکل پاک رکھا جائے، اس کے علاوہ باہر

سے آنے والے آفاقی حجاج کے لیے بھی حق عبادت کو یکساں رکھا جائے، اور جو بھی قربانی کی جائے، اس پر اللہ ہی کا نام لیا جائے۔

کیونکہ پچھلی آیات میں حرم میں قربانی کے جانوروں کا بھی ذکر ہوا تھا، تو اگلی آیات (۳۲-۳۰) میں جانوروں اور انکی قربانی کے متعلق بھی وضاحت کردی گئی کہ سور کے علاوہ مویشی جانور حلال ہیں، جو پڑھ کر سنائے جاتے ہیں، یہاں دراصل حوالہ سورہ انعام کی آیات ۱۴۲- ۱۴۵ تک کا دیا گیا ہے، جس میں بھیڑ بکری اونٹ اور گائے کے حلال ہونے کا اور خنزیر کے حرام ہونے کا ذکر ہے۔ حلال جانوروں کی قربانی میں شرک سے پرہیز کیا جائے جیسا کہ مشرک بتوں پر چڑھاوے چڑھایا کرتے تھے، مزید یہ کہ جھوٹی رسومات سے بھی گریز کیا جائے جو کہ مشرک معاشرے کی خود ساختہ تھیں، ان جاری رسومات کا بعد میں نام لیکر ذکرسورہ مائدہ (۱۰۴-۱۰۳) میں بھی کیا گیا کہ اللہ نے کوئی بحیرہ، سائبہ، وصیلہ یا حام مقرر نہیں کیا ہے۔ تقوی تودراصل اللہ کے مقرر کردہ شعائر کے احترام میں ہے نہ کہ اسکو ان خود ساختہ ناموں میں تلاش کیا جائے۔

یہاں ایک پہلو مزید غور طلب ہے، اس سورت کا نزول اس زمانے میں ہوا کہ جب ۱۲ نبوی کے حج کے موقع پر بیعت عقبہ ثانیہ ہوچکی تھی، اور مدینہ سے پہلی بار ایک قابل ذکر تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا اور پھر حج کی بجا آوری کے بعد مدینہ روانہ ہو چکے تھے۔ مدینہ میں انکو ایک ایسی قوم کا سامنا تھا، جو کہ موحد تھی یعنی کہ یہود۔ اگرچہ صدیوں سے حج کی رسم جاری تھی، اور یثرب کے لوگ اسی مقصد سے مکہ آیا بھی کرتے تھے، لیکن اس حج (۱۲ نبوی) کے بعد معاملہ بدل چکا تھا، کیونکہ وہ اب ایک موحد قوم کے طور پر مدینہ واپس ہوئے تھے۔ یہود کے لیے پہلے تو حج میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوگی، کیونکہ اس زمانے میں وہ ان عبادات کو مشرک اقوام کے تعلق سے دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے، لیکن اب مکہ میں ایک غیر اسرائیلی رسولؐ تبلیغ دین میں مصروف تھا، اور نسلی تفاخر کے باعث وہ لوگ اس رسولؐ کی پیروی کرنے سے گریزاں تھے، اور انہی کے ہم وطن اوس اور خزرج کا ایک بڑا طبقہ اس رسولؐ کی دعوت کو قبول کرکے لوٹا تھا۔ لہذا رقابت کے اس جذبہ کا عملی اظہار انہی باتوں کی صورت میں سامنے آنا تھا، کہ یہ کیسا توحیدی دین ہے کہ جس کی مرکزی عبادت گاہ، اور سب سے بڑی اجتماعی عبادت بتوں کے درمیان ہورہی ہو۔ مدینہ کے نو مسلم معاشرے کے ذہنوں میں اٹھائے جانے والے ان ممکنہ خدشات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بات کا اعلان بھی ناگزیر تھا، کہ یہ عبادت گاہ دراصل شرک کے لیے بنی ہی نہیں تھی، لہذا بتوں کو، جو کہ اس وقت مکہ میں جابجا موجود تھے،اور جن کا خاتمہ ۸ ہجری میں فتح مکہ کے بعد ہوا، نظر انداز کرتے ہوئے مسلمان حج کے ارکان اللہ کے جانب یکسو ہو کر ادا کریں۔ سورہ حج کی اس بحث میں بیت اللہ کے طواف اور قربانی کے حوالے سے بات ہوئی، اور قربانی کے جانوروں کے لیے شعائر اللہ کے الفاظ کا استعمال ہوا۔ بعد میں جب ہجرت کے بعد سورہ بقرہ (۲ ہجری) نازل ہوئی تو اس میں بھی (آیت ۱۵۸) صفا مروہ (کہ جہاں حج اور عمرہ کی سعی کی جاتی ہے) کے لیے بھی شعائر اللہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ واضح رہے کہ اس جگہ بھی اس وقت (۲ہجری) نائلہ نامی بت نصب تھا۔

آیت ۳۳ تا ۳۸ کا بیان:

لَكُمْ فِيهَا مَنَٰفِعُ إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ إِلَى ٱلْبَيْتِ ٱلْعَتِيقِ (۳۳) وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا۟ ٱسْمَ ٱللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّنۢ بَهِيمَةِ ٱلْأَنْعَٰمِ ۗ فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَٰحِدٌ فَلَهُۥٓ أَسْلِمُوا۟ ۗ وَبَشِّرِ ٱلْمُخْبِتِينَ (۳٤) ٱلَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ ٱللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَٱلصَّٰبِرِينَ عَلَىٰ مَآ أَصَابَهُمْ وَٱلْمُقِيمِى ٱلصَّلَوٰةِ وَمِمَّا رَزَقْنَٰهُمْ يُنفِقُونَ (۳٥) وَٱلْبُدْنَ جَعَلْنَٰهَا لَكُم مِّن شَعَٰٓئِرِ ٱللَّهِ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ ۖ فَٱذْكُرُوا۟ ٱسْمَ ٱللَّهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۖ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا۟ مِنْهَا وَأَطْعِمُوا۟ ٱلْقَانِعَ وَٱلْمُعْتَرَّ ۚ كَذَٰلِكَ سَخَّرْنَٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (۳٦)لَن يَنَالَ ٱللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلَٰكِن يَنَالُهُ ٱلتَّقْوَىٰ مِنكُمْ ۚ

كَذَٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُواْ ٱللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَىٰكُمْۗ وَبَشِّرِ ٱلْمُحْسِنِينَ (٣٧) ۞ إِنَّ ٱللَّهَ يُدَٰفِعُ عَنِ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْۗ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٖ كَفُورٍ (٣٨)

"تمہیں ایک وقت مقرر تک اُن (ہدی کے جانوروں) سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے پھر اُن (کے قربان کرنے) کی جگہ اسی قدیم گھر کے پاس ہے (٣٣) ہر امّت کے لیے ہم نے قربانی کا ایک قاعدہ مقرر کر دیا ہے تاکہ (اُس امّت کے لوگ) اُن جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اُس نے اُن کو بخشے ہیں (اِن مختلف طریقوں کے اندر مقصد ایک ہی ہے) پس تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے اور اُسی کے تم مطیع فرمان بنو اور اے نبیؐ، بشارت دے دے عاجزانہ رَوش اختیار کرنے والوں کو (٣٤) جن کا حال یہ ہے کہ اللہ کا ذکر سُنتے ہیں تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں، جو مصیبت بھی اُن پر آتی ہے اُس پر صبر کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اور جو کچھ رزق ہم نے اُن کو دیا ہے اُس میں سے خرچ کرتے ہیں (٣٥) اور (قربانی کے) اونٹوں کو ہم نے تمہارے لیے شعائر اللہ میں شامل کیا ہے، تمہارے لیے اُن میں بھَلائی ہے، پس انہیں کھڑا کر کے ان پر اللہ کا نام لو، اور جب (قربانی کے بعد) ان کی پیٹھیں زمین پر ٹک جائیں تو اُن میں سے خود بھی کھاؤ اور اُن کو بھی کھلاؤ جو قناعت کیے بیٹھے ہیں اور اُن کو بھی جو اپنی حاجت پیش کریں اِن جانوروں کو ہم نے اِس طرح تمہارے لیے مسخّر کیا ہے تاکہ تم شکریہ ادا کرو (٣٦) نہ اُن کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں نہ خون، مگر اُسے تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے اُس نے ان کو تمہارے لیے اِس طرح مسخّر کیا ہے تاکہ اُس کی بخشی ہوئی ہدایت پر تم اُس کی تکبیر کرو اور اے نبیؐ، بشارت دے دے نیکو کار لوگوں کو (٣٧) یقیناً اللہ مدافعت کریگا اُن لوگوں کی طرف سے جو ایمان لائے ہیں، یقیناً اللہ کسی خائن کافر نعمت کو پسند نہیں کرتا (٣٨)"

پچھلی آیات کے تسلسل میں ہی بات آگے چل رہی ہے، حرم میں قربانی کے جانوروں سے متعلق مسائل کے ساتھ ساتھ پھر یہ بات واضح کردی گئی کہ اگر یہود کے یہاں قربانی کا کوئی متعین طریقہ تھا، اور تمہارے یہاں اس سے مختلف طریقہ رائج کیا گیا ہے، تو تمہارا کام اپنے رب کے تابع فرمان ہونا ہے، یہود کے پیدا کردہ شبہات کا اسیر نہیں بننا ہے۔ عاجزی اختیار کرنے والے لوگوں کے لیے ہی اچھے انجام کی بشارت بھی ہے۔ اور ایسے لوگوں کی خصوصیات یہ بیان کی گئی ہیں کہ مشکلات آنے پر صبر کرتے ہیں، نماز کو قائم کرتے ہیں اور انفاق فی سبیل اللہ پر کاربند رہنے والے ہوتے ہیں۔ دوسری جانب حالت یہ تھی کہ یہ تمام خصوصیات یہود میں قومی سطح پر عنقاء ہو چکی تھیں۔
سورہ مائدہ (نزول ۴ہجری) میں یہود کے لعنت زدہ ہونے کی وجوہات جب بیان کی گئیں تو فرمایا گیا:

"اللہ نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا اور ان میں بارہ نقیب مقرر کیے تھے اور ان سے کہا تھا کہ "میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نے نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ دی اور میرے رسولوں کو مانا اور ان کی مدد کی اور اپنے خدا کو اچھا قرض دیتے رہے تو یقین رکھو کہ میں تمہاری برائیاں تم سے زائل کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، مگراس کے بعد جس نے تم میں سے کفر کی روش اختیار کی تو در حقیقت اُس نے سوا, السبیل گم کر دی" (١٢)
پھر یہ اُن کا اپنے عہد کو توڑ ڈالنا تھا جس کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دور پھینک دیا ---- (١٣)" (سورہ مائدہ)

اس کے بعد اونٹوں کی قربانی کا بطور خاص ذکر کیا گیا، کیونکہ بیل، بکرا اور بھیڑ کی قربانی کے تویہودی لوگ قائل تھے، لیکن اپنی فقہی موشگافیوں کے تحت اونٹوں کو نجس جانوروں کی فہرست میں شامل کرچکے تھے۔ یہاں اس بات کی خصوصی وضاحت بھی نومسلم مدنی معاشرے کے لیے زیادہ ضروری تھی، جوکہ صدیوں سے یہود کے ساتھ اپنا جیون بتاتے آئے تھے، اور یہود کے عقائد و رسومات کا کچھ نہ کچھ اثر، ممکن ہے کہ اپنی زندگیوں میں رکھتے ہوں۔ لہذا قربانی کے اونٹوں کے لیے بطور خاص بیان کیا گیا کہ وہ بھی شعائر اللہ میں شامل ہیں، تاکہ نو مسلم مدنیوں میں یا مستقبل میں اہل کتاب سے مسلمان ہونے والوں میں اونٹوں کو لیکر اگر کوئی کراہیت کا جذبہ موجود

ہو، تو وہ زائل ہوجائے۔ آگے بیان کیا گیا کہ قربانی کے جانوروں کا گوشت خود بھی کھایا جا سکتا ہے اور غرباء میں بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے اور یہ طریقہ کار بھی یہودیوں کے ہاں بعض مروج طریقوں سے مختلف تھ، کیونکہ ان کے یہاں کئی رائج قربانیوں میں یا تو پورا جانور جلا دیا جاتا تھا، یا بعض صورت حال میں کاہنوں پروہتوں کے واسطے کچھ حصہ رکھا جاتا تھا، باقی تمام گوشت اپنے استعمال میں لے آیا جاتا تھا۔ یہودیوں کے نظریے میں سوختنی قربانی میں جلائے گئے جانور کی مہک اللہ کے لئے تحفہ ہوتی تھی۔ لہٰذا آیت ۳۷ میں اللہ تعالیٰ نے قربانی کی روح کو بیان کر دیا کہ نہ تو اللہ کو گوشت پہنچتا ہے اور نہ ہی خون اسے تو اصل میں ہمارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

آیت ۳۷ کے اختتام اور آیت ۳۸ میں نومسلم مدنی مسلمان، کہ جن کو حج (۱۲نبوی) کے حج کے موقع پر تشدد اور ہراسانی کا سامنا کرنا پڑا تھا، اور مکی مسلمان، جو کہ گزشتہ بارہ برسوں سے مکہ والوں کے ظلم و استبداد کا نشانہ بنتے آئے تھے، انکے لیے بشارت دے دی گئی کہ اللہ ضرور انکے حق میں مدافعت کریگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نعمتوں میں خیانت کرنے والے کافروں کو پسند نہیں فرماتا ہے۔ اگرچہ حرم کے متولی ہونے کی حیثیت میں خیانت کا آغاز تو صدیوں پہلے ہی شروع ہوچکا تھا کہ جب بیت اللہ کو شرک کا مرکز بنا لیا گیا، لیکن اب آخری درجہ میں بھی وہ لوگ خیانت کے مرتکب ٹھہر چکے تھے، کہ باہر سے آنے والے حجاج کے لیے حرم کے راستے مسدود کرنا شروع کرچکے تھے۔ گویا اب ان پر عذاب آنے کی تمام شرائط پوری ہوچکی تھیں۔ آیت ۳۸ دراصل آیت ۲۵ سے شروع ہونے والے مضمون کا تتمہ ہے جس میں اہلیان مکہ کی جانب سے آخری خیانت یعنی کعبہ کی تولیت میں ناانصافی اور جبر کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر تادیبی اقدامات کا اعلان کر دیا گیا ہے۔

آیت ۳۸-۴۱ کا بیان: (حصہ اول)

نَّ ٱللَّهَ يُدَٰفِعُ عَنِ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْۗ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٖ كَفُورٍ (۳۸) أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَٰتَلُونَ بِأَنَّهُمۡ ظُلِمُواْۚ وَإِنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ نَصۡرِهِمۡ لَقَدِيرٌ (۳۹) ٱلَّذِينَ أُخۡرِجُواْ مِن دِيَٰرِهِم بِغَيۡرِ حَقٍّ إِلَّآ أَن يَقُولُواْ رَبُّنَا ٱللَّهُۗ وَلَوۡلَا دَفۡعُ ٱللَّهِ ٱلنَّاسَ بَعۡضَهُم بِبَعۡضٖ لَّهُدِّمَتۡ صَوَٰمِعُ وَبِيَعٞ وَصَلَوَٰتٞ وَمَسَٰجِدُ يُذۡكَرُ فِيهَا ٱسۡمُ ٱللَّهِ كَثِيرٗاۗ وَلَيَنصُرَنَّ ٱللَّهُ مَن يَنصُرُهُۥٓۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ (۴۰) ٱلَّذِينَ إِن مَّكَّنَّٰهُمۡ فِي ٱلۡأَرۡضِ أَقَامُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُاْ ٱلزَّكَوٰةَ وَأَمَرُواْ بِٱلۡمَعۡرُوفِ وَنَهَوۡاْ عَنِ ٱلۡمُنكَرِۗ وَلِلَّهِ عَٰقِبَةُ ٱلۡأُمُورِ (۴۱)

"یقیناً اللہ مدافعت کریگا اُن لوگوں کی طرف سے جو ایمان لائے ہیں، یقیناً اللہ کسی خائن کافرِ نعمت کو پسند نہیں کرتا(۳۸) اجازت دے دی گئی اُن لوگوں کو جن سے لڑائی کی جائے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں، اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے(۳۹) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے صرف اِس قصور پر کہ وہ کہتے ہیں "ہمارا رب اللہ ہے" اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہتا تو خانقاہیں اور گرجا اور کنیسے، اور مسجدیں کہ جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے، سب مسمار کر ڈالی جاتیں، اللہ ضرور اُن لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے(۴۰) یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے(۴۱)"

آیت ۲۵میں مسجد حرام کے حوالے سے مسلمانوں کے ساتھ مشرکینِ مکہ کے جس غلط طرز عمل کو لیکر تقریر شروع ہوئی تھی، اس کا اختتام آیت ۳۸ پر ہوا کہ اللہ کسی دغاباز اور ناشکرے کو پسند نہیں فرماتا ہے۔ آیت ۲۵ میں جہاں یہ فرمادیا گیا تھا کہ کجروی اختیار کرنے والوں کو ضرور عذاب دیا جائے گا، اسکا اشارہ بھی اسی آیت ۳۸ میں واضح ہوا کہ اللہ ایمان لانے والوں کی ضرور مدافعت

کریگا، اور اس سلسلے میں ایمان والوں کو کیا طرز عمل اپنانا ہوگا اسکا ذکر آیت ۳۹ میں کردیا گیا۔ آیت ۳۸ جس طرح سے پچھلے موضوع اور اگلے موضوع کے درمیان ایک پل کا کردار ادا کر رہی ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ سورہ حج کی یہ دونوں تقریریں لازماً ایک ہی موقع پر نازل ہوئی ہیں، کیونکہ آیت ۳۹ میں اگر جہاد کا بیان ہوا ہے، تو اس سے پہلے آیت ۳۸ میں اللہ نے مومنین کو پیشگی خوش خبری عطا کردی ہے کہ وہ اگر جہاد کرتے ہیں تو اللہ ضرور ان کے دشمنوں کو ہٹادیگا۔

سورہ حج کی آیت ۳۹ قرآن کریم کی وہ پہلی آیت ہے کہ جس میں مسلمانوں کو جہاد کی اجازت ملی. عام طور پر یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ کیونکہ جہاد کا عملی آغاز مدینہ جاکر ہوا تھا جب کہ باقاعدہ اسلامی ریاست قائم ہو گئی تھی، لہٰذا جہاد سے متعلق آیات کا نزول بھی مدنی دور میں ہی ہونا چاہیے، خواہ ان ہی آیات کی بالکل اگلی پچھلی آیات اس مفروضے کی مکمل نفی بھی کر رہی ہوں۔ اس سوچ کی بنیادی وجہ سعید بن جبیر کی وہ روایتیں بنی ہیں جو وہ حضرت ابن عباسؓ سے منسوب کر کے (یا بعض دفعہ بلا منسوب کرے) آگے بیان کرتے ہیں۔ امام حاکم اپنی کتاب مستدرک علی الصحیحین میں روایت کرتے ہیں:

"---سفیان بن ثوری بذریعہ اعمش بذریعہ مسلم البطین بذریعہ سعید بن جبیر ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں جب نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مکہ سے نکلے تو ابوبکرؓ نے کہا "ان لوگوں نے اپنے نبیؐ کو اپنے شہر سے نکالا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ضرور ضرور یہ قوم ہلاک ہوگی"اس وقت آیت اذن للذین یقتلون بانہم ظلموا (سورہ حج آیت ۳۹) نازل ہوئی .... ابوبکرؓ نے فرمایا میں جانتا ہوں عنقریب جنگ ہوگی۔ ابن عباسؓ نے فرمایا یہ پہلی آیت ہے جو جہاد کے بارے میں نازل ہوئی"۔ (امام حاکم اس روایت کو بخاری اور مسلم کی شرائط پر صحیح گردانتے ہیں)۔

یہی روایت الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ ترمذی، عبد الرزاق، احمد، عبد بن حمید، نسائی، ابن ماجہ، بزار، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابن حبان، طبرانی، ابن مردویہ اور بیہقی نے بھی بیان کی ہے۔ اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس روایت کا اثر اس وقت کے مسلمان ذہن پر کس حد تک پڑا تھا کہ شاید ہی کوئی کتاب بچی ہو جس میں یہ روایت بیان نہ ہوئی ہو۔ غور کیا جائے تو ازروئے روایت بھی تو یہ پہلی آیت (سورہ حج آیت ۳۹) ہی تھی کہ جس میں جہاد کی اجازت دی گئی تھی تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے پھر اس کے نزول سے پہلے انا للہ وانا الیہ راجعون کیسے کہہ دیا کیونکہ اسکی آیت (سورہ بقرہ، آیت ۱۵٦) تو خود جہاد سے متعلق احکام کے درمیان آئی ہے۔ سورہ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے:"اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں، انہیں مُردہ نہ کہو، ایسے لوگ تو حقیقت میں زندہ ہیں، مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا (۱۵٤) اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے (۱۵۵) اِن حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے، تو کہیں کہ انا للہ وان الیہ راجعون (۱۵٦) انہیں خوش خبری دے دو ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی، اُس کی رحمت اُن پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رَو ہیں (۱۵۷)" (سورہ بقرہ ، نزول ۱-۲ہجری)

پس معلوم ہوا کہ اگر سورہ حج کی یہ آیت (۳۹) جہاد کے موضوع سے متعلق پہلی نازل شدہ آیت ہے اور اس بات کی تصدیق خود سعید بن جبیر کی درج بالا روایت بھی کر رہی ہے تو انا للہ وانا الیہ راجعون والی آیت تو اس وقت تک پھر نازل ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اور جب وہ نازل ہی نہیں ہوئی تھی، تو حضرت ابوبکرؓ کس طرح اسکی تلاوت فرماسکتے تھے، اور اگر بالفرض انا للہ وانا الیہ راجعون نازل ہوچکی تھی تو پھر سورہ حج کی یہ آیت (۳۹) جہاد کے متعلق پہلی آیت کیسے قرار دی جا سکتی ہے؟ گویا روایت کا ایک حصہ خود ہی دوسرے حصے کی تردید کر رہا ہے۔

جامع ترمذی میں سعید بن جبیر کے حوالے سے ہی اسی سند کے ساتھ ایک دوسری روایت بھی موجود ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے نکالے گئے، ایک آدمی نے کہا:"ان لوگوں نے اپنے نبی کو نکال دیا تو اس پر آیت "ان لوگوں کو بھی لڑنے کی اجازت دے دی گئی جن سے مظلوم سمجھ کر جنگ چھیڑ رکھی گئی ہے، اللہ ان (مظلومین) کی مدد پر قادر ہے" (الحج: ٣٩) نازل ہوئی، یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو ناحق نکال دیا گیا" (جامع ترمذی، کتاب التفسیر)

ایک ہی سند کے ساتھ ایک ہی کتاب میں موجود یہ روایات متن کے اعتبار سے جدا جدا ہیں۔ اگرچہ دونوں اس بات پر تو متفق ہیں کہ یہ آیت نبی کریم کے مکہ چھوڑنے کے بعد نازل ہوئی ہے لیکن وجہِ نزول دونوں میں مختلف ہیں۔ ایک جانب رفیق سفر حضرت ابو بکرؓ کے الفاظ اس آیت کے نزول کا باعث بیان کیے گئے ہیں تو دوسری جانب مکہ میں موجود کوئی گمنام شخص وجہِ نزول معلوم ہوتا ہے۔ تطبیق کرنے والے ان دونوں روایات میں بہرحال تعلق نکال لینگے۔ سعید بن جبیر کی یہ روایت ان وجوہات میں سر فہرست ہے کہ جن کی وجہ سے مفسرین کرام اس سورت کو ایک عجیب و غریب سورت کہتے ہیں کہ جس کی کوئی آیت سفر میں نازل ہوئی تو کوئی حضر میں۔ گویا پوری سورت بکھرے ہوئے موضوعات کا ایک مجموعہ ہے۔ سعودی عالم جناب عصام بن صالح العوید سورہ حج کے متعلق مضمون میں "عجیب سورت" کی سرخی ڈالتے ہوئے اسکے ذیل میں لکھتے ہیں:

"میں نے ایک لمبے عرصے تک اس سورت کے مضامین پر غور کیا ہے، سلف صالحین اور متاخرین میں سے اہل تحقیق کی آراء پر غور کیا، میں اس سورت کو کوئی (مضامین کے حوالے سے) خاص نام دینے میں ناکام رہا، بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ گہرا علم رکھنے والے علماء کی سورت ہے۔ اس لیے کہ اسکے معنی میں بڑی گہرائی ہے، سابقہ عبارتوں سے آیات کا ربط بڑا مشکل ہے اور اسکی تفسیر میں بڑے بڑے مفسرین میں باہم اختلاف پایا جاتا ہے"۔

جب علماء کے طبقے کے وہ لوگ جو اپنی زندگیاں قران کی خدمت میں وقف کرگئے ہیں، ان کے قلم سے اگر ایسے الفاظ نکل رہے ہیں، تو ہما شما کا کیا کہنا۔ قران کریم انسان کے لیے بطور ہدایت نازل ہوا ہے، اگر اسکے مضامین اس قدر مبہم یا پرپیچ ہوتے، تو ہدایت نامہ آخر کس واسطے جاری کیا گیا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ اس سورت کی آیات ہرگز بے ربط نہیں ہیں، بلکہ سعید بن جبیر اور اس قبیلہ کے دیگر لوگوں کی روایات نے سورہ الحج کے مضامین کو بری طرح تہس نہس کیا ہے اور امت کے ذہن میں یہ بات جاگزیں کردی ہے کہ آیاتِ قرانی اپنے ربط سے نہیں بلکہ نام نہاد شان نزولوں کے آئینے میں سمجھی جائیں گی۔ لہٰذا روایات کے اثر میں جو لوگ آیاتِ قرانی کا نزول منتشر اجزا کی صورت میں مان گئے ہیں کہ تئیس سالوں کے طویل عرصے میں جدا جدا آیات کا مختلف وقتوں میں نزول ہوتا رہا اور جن کو بعد کے کسی دور میں امت نے ہی سورتوں کی شکل میں مرتب کر دیا، وہ تو رہے ایک طرف، لیکن وہ لوگ بھی جو نظم قرآن کے قائل ہیں، سورت کے الفاظ میں باہم ربط مانتے ہیں اور آیات کو ان کے محل سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، (جیسا کہ کسی بھی مضمون کو سمجھنے کے لیے کیا جاتا ہے اور کیا جانا چاہیے) وہ بھی اس پروپیگنڈا روایت کے اثر میں اس آیت کو مدنی قرار دے گئے ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ جنھوں نے نظم کے اعتبار سے سورتوں کی تفسیر کی ہے اور سورہ حج کو ایک مکی سورت مانا ہے، اس کے باوجود بھی اس آیت(٣٩) اور اس سے متصل تین آیات کو مدنی قرار دے دیتے ہیں۔ گویا عملاً سورہ حج کی حد تک تو کم از کم وہ بھی وہی کام کر گئے جس کے خلاف انہوں نے علم بلند کیا تھا۔ سوال یہ لازماً پیدا ہوتا تھا کہ ایک مکی سورت کے جاری مضمون میں آخر چار آیات کا اضافہ بعد کے کسی دور میں کس لیے کردیا گیا، تو بات بٹھانے کے لیے انہوں نے جہاد کی اس اجازت کو حج کے ساتھ بھی مشروط کر دیا کہ اگر کفارِ قریش مدینہ

والوں کو بزور طاقت حج کی ادائیگی سے روکیں تو مسلمانوں کو اپنی مدافعت میں تلوار اٹھانے کا حق ہوگا، مولانا اس نتیجہ پر اس لیے پہنچے کیونکہ اسی سورت کی پچھلی آیات میں حج کے معاملات زیر بحث آئے تھے۔ سورت کے عمود اور زمانہ نزول کی ذیل میں فرماتے ہیں کہ "ان آیات (۳۸-٤١) کی نوعیت بھی محض توضیحی آیات کی ہو (ہے)... ان کی حیثیت اجمال کے بعد تصریح کی ہے۔ ایک بات جو مکی زندگی کے آخری دور میں فرمائی گئی تھی جب مدنی زندگی کے ابتدائی دور میں اس کی تفصیل نازل ہوئی تو اجمال اور تفصیل دونوں کو ایک ساتھ رکھ دیا گیا"۔

آگے چل کر سورت کے مطالب کا تجزیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں "۳۸-٤١ یہ چار آیتیں مدنی ہیں۔ مسلمان مدینہ ہجرت کے بعد جب ایک منظم جماعت بن گئے تب یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر وہ حج کے لئے جائیں تو ان کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟... اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ اجازت دے دی کہ اگر اس طرح کی کسی جنگ کی نوبت آئے تو تم بھی جنگ کرو۔ یہ جنگ اشہر حرم یا حرم کی حرمت کے منافی نہیں ... تطہیر بیت اللہ کے لئے جہاد کی یہ اجازت کیونکہ اسی بات کا ایک لازمی نتیجہ تھی ... اسی وجہ سے جب یہ آیتیں نازل ہوئیں تو گو یہ نازل مدینہ میں ہوئیں لیکن ترتیب میں ان کو جگہ یہاں دی گئی تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ صورت حال کے تقاضے سے یہ اجازت دی گئی"۔اصلاحیؒ صاحب کے مطابق جب خاص حج کے موقع کے لیےجہاد کی اجازت دے ہی دی گئی تھی، تو لازماً سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھراس اجازت کا استعمال کیوں نہیں کیا گیا۔

مضمون دیکھا جائے تو یہاں حج کی شرط کے ساتھ جہاد کی اجازت کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ مشرکین اور مسلمانوں کے درمیان مستقبل میں براہ راست ٹکراؤ ہونے کا اشارہ مل رہا ہے۔ تاریخی اعتبار سے بھی اس کی تصدیق نہیں ہوتی کیونکہ گروہی شکل میں مدینہ منورہ سے حج یا عمرے کی نیت سے مکہ مکرمہ جانے کا کوئی معروف واقعہ صلح حدیبیہ (٦ ہجری) سے پہلے موجود نہیں ہے۔ لیکن اگر بالفرض مولانا اصلاحیؒ کی اس بات کو تھوڑی دیر کے لیے مان بھی لیا جائے کہ یہاں تطہیر بیت اللہ کے لیے اشہر حرم میں جنگ لڑنے کی اجارت دی گئی ہے، تو پھر سورہ بقرہ کی اس آیت کا کیا کیا جائے جس میں لوگوں کی طرف سے خاص اسی موضوع کو لیکر سوال اٹھا تھا۔ سورہ بقرہ (۲ ہجری) کی آیت ۲١۷میں ارشاد ہوتا ہے:

"وہ تم سے شہر حرام میں جنگ کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو اس میں جنگ بڑی سنگین بات ہے۔ لیکن اللہ کے راستہ سے روکنا، اس کا کفر کرنا، مسجد حرام سے روکنا اور اس کے لوگوں کو اس سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس جنگ سے بھی زیادہ سنگین ہے..." (سورہ بقرہ، آیت ۲١۷، مترجم مولانا امین احسن اصلاحیؒ)

اگر سورہ حج کی ان 'توضیحی' آیات میں اشہر حرم میں جنگ کی اجازت ہی کا ذکر تھا، تو اس سوال کا جواز باقی نہیں رہتا تھا، جو سورہ بقرہ کی درج بالا آیت میں پیش کیا گیا ہے۔ باقاعدہ تفسیر کے دوران آیت ۳۸-٤١ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "یہ آیات مدینہ میں نازل ہوئیں اور چونکہ یہ جیسا کہ ہم تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں، انہی باتوں پر متفرع اور انہی کی توضیح کی حیثیت رکھتی ہیں جو اوپر بیان ہوئی ہیں (آیات ۲۵ - ۳۷) اس وجہ سے ان کو مصحف کی ترتیب میں یہاں جگہ ملی"۔

اگر ان کی اس دلیل کو پرکھاجائے کہ پہلے سے جاری کسی موضوع کی توضیحی آیات کو نازل شدہ سورت کے درمیان اس طرح رکھ دیا جاتا تھا کہ سورت کی شکل ہی بدل جائے، تو پھر سورہ احزاب کی آیت ٤۹ کا کیا کیا جائے جو کہ طلاق اور عدت کے موضوع پر اس سورت میں ایک منفرد آیت ہے۔ اصلاحیؒ صاحب کی بیان کردہ دلیل کے مطابق اس آیت کا جائز مقام تو پھرسورہ بقرہ یا سورہ طلاق ہونا چاہیے تھا جہاں طلاق وعدت کے مسائل پر تفصیلی بحث موجود ہے، نہ کہ سورہ احزاب میں۔ مزید یہ کہ اصلاحیؒ صاحب جب سورہ احزاب کی آیت ٤۹ کی تشریح فرماتے ہیں تو اس آیت کو

سورہ نساء کی بعض آیات کی توضیح کے طور پر پیش فرماتے ہیں نہ کہ سورہ احزاب کے پچھلی آیات کی توضیح کے طور پر۔ اگر بالفرض یہ آیت سورہ نساء کے مضامین ہی کی توضیحی آیت تھی، تو پھراصلاحیؒ صاحب کے ہی پیش کردہ نظریہ کے مطابق اسکو سورہ احزاب کی بجائے سورہ نساء میں شامل کیا جانا چاہیے تھا۔ سورہ احزاب میں طلاق وعدت کے موضوع سے متعلق یہ آیت اس نظریہ کے ابطال کا بین ثبوت ہے کہ مختلف وقتوں میں نازل شدہ ہم موضوع آیات کو بعد کے کسی وقت میں ایک سورت میں اکھٹا کر دیا جاتا تھا۔ مولانا مودودیؒ سورہ احزاب کی آیت ٤٩ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "یہ ایک منفرد آیت ہے جو غالباً اسی زمانے میں طلاق کا کوئی مسئلہ پیدا ہوجانے پر نازل ہوئی تھی، اس لیے پچھلے سلسلۂ بیان اور بعد کے سلسلۂ بیان کے درمیان اس کو رکھ دیا گیا۔ اس ترتیب سے یہ بات خود مترشح ہوتی ہے کہ یہ تقریر ما سبق کے بعد اور تقریر ما بعد سے پہلے نازل ہوئی تھی"۔

سورت کے مضمون میں کسی آیت کے اضافے کے لحاظ سے سورہ نساء اور سورہ مزمل مزید رہنمائی فرمادیتی ہیں۔ سورہ نساء میں وراثت کے موضوع پر آیات ابتدائے سورت میں گزر چکی تھیں۔ عرصہ بعد جب اسی موضوع پر ایک توضیحی آیت نازل ہوئی تو اس کو سورت کے درمیان نہیں ٹانک دیا گیا تھا بلکہ جس ترتیب سے وہ نازل ہوئی اسی ترتیب سے اس کو جگہ دی گئی یعنی کہ سورت کے آخر میں۔ مولانا اصلاحیؒ جب سورہ نساء کی اس آخری آیت کی تفسیر کر رہے ہیں تو وہ خود بھی اس کے لیے ضمیمہ کا لفظ استعمال کر رہے ہیں اور مان رہے ہیں کہ اس کو درمیان سورت میں وراثت کے موضوع کے ساتھ نہیں رکھا گیا، بلکہ بعد میں نازل ہونے کے سبب یہ سورت کے آخر میں ہی شامل ہوئی۔ سورہ احزاب کی آیت ٤٩، سورہ مزمل، اور سورت نساء کی آخری آیت کی جو بحث تدبر قران میں مولانا اصلاحیؒ نے فرمائی ہے اسی کی روشنی میں دیکھا جائے تو سورہ حج کی ان چار آیات (٣٨-٤١) کے مدنی ہونے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔

مولانا اصلاحیؒ کے برخلاف مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ سورت کے درمیان میں توضیحی آیات کے اضافے کے نظریے کے بڑی حد تک قائل نہیں ہیں۔ اگرچہ ابتداً سورہ بقرہ اور آل عمران کی تفسیر کرتے وقت وہ اسی فلسفے کے کسی قدر پیرو نظر آئے ہیں لیکن بعد کی کئی سورتوں بشمول سورہ حج میں وہ اس نظریے کی شدت سے تردید بھی کرتے رہے ہیں۔ سورہ احزاب کی مذکورہ آیت (٤٩) پر انکی بحث بھی اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ سورہ حج کے سلسلے میں دیکھا جائے تو ابتدائی آیات کو انھوں نے بھی مکی دور کا ہی مانا ہے، کیونکہ ان آیات کے موضوعات خالصتاً وہی ہیں جو کہ آخری دور کی کسی مکی سورت کے ہیں۔ لیکن آیت ٣٩ کے متعلق اسی مروجہ شان نزول کے اثر میں انھوں نے اس سورت کے آخری حصے کو مدنی قرار دے دیا ہے۔ اب کیونکہ آیت ٣٨ سورت کی دوسری تقریر(٢٥-٣٨) اور تیسری تقریر(٣٨-٦٦) کی مشترکہ آیت ہے، لہٰذا انھوں نے سورہ حج کا مدنی حصہ دوسری تقریر کے آغاز یعنی آیت ٢٥ سے لے کر اختتام سورت تک بیان کر دیا ہے۔ اس طرح انھوں نے آیات کے منتشر اجزا کے طور پر نازل ہونے اور بعد میں مختلف سورتوں کے درمیان میں انکی ہونے والی پیوندکاری کے نظریہ کا تو انکار کردیا لیکن ایک ہی سورت کے دو حصوں کو بلا ضرورت دو مختلف ادوار میں نازل ہونے کی توثیق کر گئے اور ظاہر ہے اسکا بنیادی سبب سعید بن جبیر کی یہی روایت بنی ہے کہ جس نے امت کے اجتماعی ذہن کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ آیت ٢٥ اور اس کے بعد کی آیات میں کیونکہ حج کے مسائل زیر بحث ہیں، لہٰذا مولانا مودودیؒ کی تفہیم کے مطابق بعد از ہجرت سورت کے اس حصے کا دور نزول ذی الحجہ ایک ہجری بنتا ہے۔ آیت ٣٩ کیونکہ حج سے متعلق آیات کے بعد ہے لہذا یہ آیت بھی انکی نظر میں ہجرت (ربیع الاول ١ ہجری) کے دس ماہ بعد ہی نازل ہونا قرار پائی۔ فرماتے ہیں "یہ (آیت ٣٩) قتال فی سبیل اللہ کے بارے میں اولین آیت ہے جو نازل ہوئی۔ اس آیت میں صرف اجازت دی گئی تھی۔ بعد میں سورہ بقرہ کی وہ

آیات نازل ہوئیں جن میں جنگ کا حکم دے دیا گیا .... اجازت اور حکم میں صرف چند مہینوں کا فصل ہے۔ اجازت ہماری تحقیق کے مطابق ذی الحجہ ۱ ہجری میں نازل ہوئی، اور حکم (سورہ بقرہ) جنگ بدر سے کچھ پہلے رجب یا شعبان ۲ ہجری میں نازل ہوا"۔

سورہ حج کے اس حصے کو بلا ضرورت مدنی ماننے کی راہ مولانا مودودیؒ کو سعید بن جبیر کی جس مشہور زمانہ روایت نے دکھائی، اسی راہ پر چلتے ہوئے بھی بالاخر دوران تفسیر انھیں اسی روایت کا ایک درجہ میں انکار تو کرنا ہی پڑا۔ روایت کے اس نتیجے کو تو انھوں نے قبول کر لیا کہ یہ آیات مکی نہیں ہیں لیکن نظم قران کی بنیاد پر وہ یہ ماننے پر بھی مجبور ہوئے کہ روایت کے بیان کے برخلاف یہ آیات اثنائے ہجرت میں بھی نازل نہیں ہوسکتیں۔ کاش اُسی وقت اس روایت سے اخذ کردہ ابتدائی نتیجہ پر بھی دوبارہ غور فرمالیتے تو ان کو واضح ہو جاتا کہ نظم قران کی بنیاد پر جیسے وہ ان آیات کا دوران ہجرت نازل ہونا خارج از امکان مان رہے ہیں ویسے ہی ان آیات کا مدنی ہونا بھی ناممکن ہے، اور اس طرح سورت کی اگلی وہ آیات جو کہ براہ راست مشرکینِ مکہ سے مخاطب ہیں یا وہ آیات جو اُس ماحول سے متعلق ہیں، جو مکی زندگی کے بالکل آخری دور میں پیدا ہوا، ان کی تفسیر میں غیر ضروری ابہام پیدا نہیں ہوتا۔ مزید یہ کہ اگر قتال کے سلسلے کی اس پہلی آیت کا نزول ذو الحجہ ایک ہجری مان لیا جائے تو پھر ان سرایا کی کیا توجیہ کی جائے گی جو کہ ذو الحجہ ایک ہجری سے پہلے وقوع پذیر ہوئے مثلاً سریہ سیف البحر (رمضان ۱ ہجری)، سریہ ثنیہ المرہ (شوال ۱ ہجری)، سریہ خرار (ذو القعدہ ۱ ہجری) وغیرہ۔

مفتی محمد شفیع صاحبؒ تفسیر معارف القران میں آیت ۳۸ کے اختتام پر پچھلی آیات کا خلاصہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:"سابقہ آیات میں اس کا ذکر تھا کہ مشرکین نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے صحابہ کو جو عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ مکرمہ کے قریب مقام حدیبیہ پر پہنچ چکے تھے حرم شریف اور مسجد حرام میں جانے اور عمرہ ادا کرنے سے روک دیا تھا اس آیت(۳۸) میں مسلمانوں کو اس وعدہ کے ساتھ تسلی دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ عنقریب ان مشرکین کی اس قوت کو توڑ دے گا جس کے ذریعہ وہ مسلمانوں پر ظلم کرتے ہیں یہ واقعہ ٦ ہجری میں پیش آیا تھا اس کے بعد سے مسلسل کفار مشرکین کی طاقت کمزور اور ہمت پست ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ ۸ ھ میں مکہ مکرمہ فتح ہوگیا۔ اگلی آیات میں اس کی تفصیل آ رہی ہے"۔

مفتی صاحبؒ نے دراصل اس مقام پر آیت ۲۵ میں روکے جانے کے ذکر کو صلح حدیبیہ سے متصف کیا ہے۔ اور پھر اگلی آیت ۳۹ اور اسکے بعد والی آیات کو صلح حدیبہ اور پھرفتح مکہ کی تفصیل کے طور پر بیان کیا ہے، لیکن جب آیت ۳۹ یا مابعد کی تشریح انہوں نے کی ہے، تو سعید بن جبیر کی اسی روایت کے تناظر میں کی ہے، یعنی ٦ ہجری کے بعد کے واقعات کی تفصیل اس روایت سے کر رہے ہیں جو سعید بن جبیر کے مطابق رسول اللہ کے دوران ہجرت نازل ہوئی تھی۔ مفتی محمد شفیع صاحبؒ آیت ۳۹ کے ذیل میں فرماتے ہیں:"(گو اب تک بمصالح کفار سے لڑنے کی ممانعت تھی لیکن اب) لڑنے کی ان لوگوں کو اجازت دے دی گئی جن سے (کافروں کی طرف سے) لڑائی کی جاتی ہے اس وجہ سے کہ ان پر (بہت) ظلم کیا گیا ہے (یہ علت ہے مشروعیت جہاد کی) اور (اس حالت اذن میں مسلمانوں کی قلت اور کفار کی کثرت پر نظر نہ کرنا چاہیے کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کے غالب کردینے پر پوری قدرت رکھتا ہے"۔ جہاد کی اجازت کے بعد تو مشرکین مکہ سے بدر(۲ ہجری)، احد(۳ ہجری) اور خندق(۵ہجری) کی جنگیں ہو چکی تھیں، حدیبیہ تو انکے بعد ٦ ہجری میں ہوئی، اگر یہ آیت حدیبیہ کے بعد کے حالات کی تفصیل مانی جائے، تو حدیبیہ میں تو لڑائی ختم ہوجانے کا معاہدہ ہوگیا تھا، سورہ فتح (نزول ٦ ہجری) جو کہ صلح حدیبیہ ہی کے بعد نازل ہوئی، اس میں ارشاد ہوتا ہے:"وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں اُن کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ اُن سے روک دیے، حالانکہ وہ اُن پر تمہیں غلبہ عطا کر چکا تھا اور جو کچھ تم کر رہے تھے اللہ اسے دیکھ

رہا تھا (۲٤) وہی لوگ تو ہیں جنہوں نے کفر کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا اور ہدی کے اونٹوں کو اُن کی قربانی کی جگہ نہ پہنچنے دیا اگر (مکہ میں) ایسے مومن مرد و عورت موجود نہ ہوتے جنہیں تم نہیں جانتے، اور یہ خطرہ نہ ہوتا کہ نادانستگی میں تم انہیں پامال کر دو گے اور اس سے تم پر حرف آئے گا (تو جنگ نہ روکی جاتی روکی وہ اس لیے گئی) تاکہ اللہ اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل کر لے وہ مومن الگ ہو گئے ہوتے تو (اہل مکہ میں سے) جو کافر تھے ان کو ہم ضرور سخت سزا دیتے (۲۵)"یہاں تو خود ارشاد ہو رہا ہے کہ لڑائی ہونے والی تھی، اور اس لڑائی کو اللہ تعالی نے آیت میں بیان کی گئی وجہ کی بنیاد پر روک دیا تھا، پھر ایک ایسی آیت جس میں لڑائی کرنے کی اجازت دی جارہی ہو، حدیبیہ کے بعد کے حالات کی تفصیل کیوں کر قرار دی جاسکتی ہے۔ سورہ فتح کے آغاز پر ہی اللہ تعالیٰ نے فتح مبین کی خوش خبری سنادی تھی۔ یعنی یہ جو صلح کی گئی ہے یہ اب مکہ کی فتح پر منتج ہوگی۔ تاریخی ماخذات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حدیبیہ کا معاہدہ ۸ ہجری میں ختم بھی مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان کسی براہ راست لڑائی کی وجہ سے نہیں ہوا تھا، بلکہ ان کے حلیفوں کی باہم لڑائی (بنو بکر بنو خزاعہ) اس کے تنسیخ کی وجہ بنی تھی، اور پھر کچھ ہی دن بعد بنا کسی لڑائی کے مکہ فتح(رمضان، ۸ ہجری) ہو گیا، گویا تفسیر معارف القران کے مطابق اگر پچھلی آیات حدیبیہ سے متعلق ہیں، تو یہ آیات(۴۱-۳۹) حدیبیہ کے بعد کے حالات سے بالکل غیر متعلق ٹھہرتی ہیں۔

مولانا عبدالکریم اثریؒ تفسیر عروۃ الوثقیٰ میں اسی آیت(حج، ۳۹) کی تفسیر کے ذیل میں فرماتے ہیں: "ہمارے مفسرین نے یہ قتال کا حکم پہلا حکم بتایا ہے جو کسی حال میں بھی صحیح نہیں اس لئے کہ --- مدینہ طیبہ آنے کے بعد سب سے پہلے جو سورت نازل ہوئی وہ بالاتفاق البقرہ ہے --- جس میں بعض جنگوں کی پوری تفصیل دی گئی اس لئے اس حکم کو جہاد کا پہلا حکم نہیں قرار دیا جاسکتا پھر یقاتلون کے الفاظ خود اس بات پر دال ہیں کہ جنگ جاری ہے اور --- اس وقت جس ظلم کی بات کی جا رہی ہے وہ ظلم حج وعمرہ کی رکاوٹ کا ہے --- اور بلاشبہ یہی وہ اجازت ہے جس کو ملنے کے بعد نبی اعظم وآخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے باقاعدہ عمرہ کی تیاری کی اور عمرہ کی غرض سے مکہ والوں کو اطلاع دے کر مکہ میں بغرض عمرہ داخل ہونے کی کوشش فرمائی "

مولانا اثریؒ نے مفتی شفیعؒ کے برخلاف سورت کی پچھلی آیت (۲۵) کہ جس میں مسجد حرام سے روکے جانے کا ذکر ہے، اس کو حدیبیہ (٦ ہجری) والے واقعہ کی بجائے مشرکین مکہ کے مسلمانوں کو حرم سے روکنے کے عمومی رویے کے ساتھ جوڑا ہے۔ تاہم پھر بھی سورہ حج کی اس آیت (۳۹) کو حدیبیہ ہی کے پس منظر میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ "بلاشبہ یہی وہ اجازت ہے جس کو ملنے کے بعد نبی اعظم وآخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے باقاعدہ عمرہ کی تیاری کی"۔ اگر تو اسی آیت کے تناظر میں رسول اللہ نے عمرے کا قصد کیا تھا، تو سورہ فتح جو کہ اسی سفرِعمرہ کے حالات کے متعلق نازل ہوئی، وہاں نہ تو اس آیت(حج ۳۹) کا حوالہ عمرے کی تیاری کی غرض سے بیان کیا گیا ہے اور نہ ہی پوری سورت میں اس آیت(حج، ۳۹) کا نزول اس وقت کے ماحول میں ہونے کا کوئی تاثر ملتا ہے، بلکہ سورہ فتح (ذوالقعدہ ٦ ہجری) میں جب اس وقت کے حالات کی منظر کشی کی گئی ہے، تو فرمایا گیا ہے " فی الواقع اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھا یا تھا جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق تھا انشاءاللہ تم ضرور مسجد حرام میں پورے امن کے ساتھ داخل ہو گے"(سورہ فتح، آیت ۲۷)، گویا سورہ فتح تو ٦ ہجری میں ہونے والے اس عمرے کے سفر کی بنیاد ایک خواب کو بیان کر رہی ہے۔ اگر یہ سفر واقعتاً اس اصول کے تحت ہوا ہوتا کہ بالفرض عمرے کی اجازت نہ دی گئی تو آیت ۳۹ کی روشنی میں جنگ کا آپشن استعمال کیا جائے گا، تو پھرعمرے سے روکے جانے پر حضرت عثمانؓ کو مکہ والوں سے مذاکرات کے لیے بھیجنے کا مقصد کیا رہ گیا تھا، اور سب سے بڑھ کر بیعت رضوان کی اہمیت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ جب پہلے ہی ممکنہ جنگ کا ذہن بناکر

مدینہ سے نکلا گیا تھا، تو پھر اب کس بات کی بیعت لی گئی تھی، جبکہ اذن تو سفر عمرہ سے پہلے ہی نازل ہوچکا تھا۔ مزید یہ کہ سورہ فتح ہی یہ بھی بیان کرتی ہے کہ جب یہ قافلہ مدینہ سے نکلا تھا تو مضافات کے وہ بدو جنہوں نے شریک سفر ہونے سے انکار کردیا تھا، یہ گمان کر رہے تھے کہ اب مسلمان واپس مکہ سے پلٹ نہ سکیں گے(سورہ فتح، آیت ١٢)۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ سفر جنگی تیاری کے ساتھ کیا گیا ہوتا، تو بدو لوگ یہ اندازہ کیوں کر لگاتے، انہوں نے تو یہ گمان کیا ہی اس لیے تھا کہ مسلمان بنا کسی آلات حرب کے، اپنی تلواریں حمائل کیے محض عمرے کی نیت سے مکہ روانہ ہوئے تھے۔ مزید یہ کہ جب صلح کا معاہدہ تحریر ہوا، تو بیان کیا جاتا ہے کہ صحابہؓ کرام اپنے آپ کو شکستہ دل محسوس کر رہے تھے، بلکہ حضرت عمرؓ کا رسول اللہ کے ساتھ مکالمہ بھی بہت مشہور ہے، اس میں بھی حضرت عمرؓ نے اس آیت(حج، ٣٩) کا حوالہ نہیں دیا کہ جب جنگ کی یہ اجازت خاص اسی موقع کے لیے ہی آئی ہے تو اسکو اختیار کیوں نہیں کیا جارہا۔ اگر تو یہ آیت(حج، ٣٩) اسی مقصد کے تحت نازل ہوئی تھی، تو اسکا استعمال نہ تو حدیبیہ میں ہوا، اور نہ ہی فتح مکہ تک کسی اور موقع پر، بلکہ سورہ فتح تو بیان کرتی ہے کہ آئندہ مسلمان امن کے ساتھ مسجد الحرام میں داخل ہونگے(سورہ فتح، آیت ٢٧)۔ سورہ فتح کی کسی آیت سے بھی ایسا کوئی تاثر نہیں ملتا ہے کہ خاص اس موقع پر کسی ایسے جہاد کی اجازت دی گئی تھی، جو کہ پہلے سے موجود نہیں تھی۔ سب سے بڑی اور اہم بات یہ ہے کہ اس آیت میں جن لوگوں کو جہاد کی اجازت دی گئی ہے، وہ مہاجرین ہیں، کیونکہ اگلی آیت (حج،٤٠) میں اجازت کے حامل افراد کے متعلق بتادیا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے۔ رسول اللہ کے ساتھ جو ١٤٠٠ صحابہ کرامؓ عمرے کی نیت سے نکلے تھے، ان میں غالب ترین اکثریت انصاریوں کی تھی، بالفرض اگر اس موقع پر جنگ ہوتی، تو کیا صرف مہاجرین لڑتے، آخر انصاری کس حیثیت میں تلوار اٹھا سکتے تھے، کہ جبکہ انکے لیے اس آیت(حج، ٣٩) کے تحت کوئی اجازت تھی ہی نہیں۔ اپنی اس تشریح کے تناظر میں اٹھنے والے اس جائز سوال کا جواب مولانا عبدالکریم اثریؒ نے اس طرح دیا ہے کہ اگلی آیت(٤٠) کو اس اجازت(٣٩) سے بڑی حد تک غیر متعلق کرکے اسکو مسلمانوں کی مظلومیت کے ذکر کے ذیل میں بیان کردیا ہے۔ محترم مہینوں اور حدود حرم دونوں میں جنگ کی اجازت سورہ بقرہ(٢ ہجری) کی آیات ٢١٧ اور ١٩١میں دی جاچکی تھی، اور انہی دونوں آیات کی روشنی میں بیعت رضوان بھی ہوئی تھی۔ گویا حدیبیہ کے موقع پر کسی بھی متوقع یا غیر متوقع ناخوشگوار صورت حال پیدا ہونے کی صورت میں اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے آیات پانچ سال قبل سورہ بقرہ میں نازل ہوچکی تھیں۔

چار مختلف مفسرین کرام نے ایک ہی آیت کو چار مختلف رنگوں میں پیش کیا ہے۔ مزید تفاسیر کا مضمون میں اضافہ کیا جائے تو یہ اختلاف مزید بڑھ جاتا ہے۔ بنیادی وجہ سعید بن جبیر کی یہی روایت بنی کہ جسکی روشنی میں آیت (٣٩) کی تفسیر کا کیا جانا تھا، اور جب بات درست طور پر نہیں بیٹھ پائی، تو یا تو تفسیر کو مبہم چھوڑدیا گیا (معارف القران)اور یا پھر دورِ نزول (تفہیم القران) یا وجہِ نزول (تدبر قران، عروۃ الوثقیٰ)کو از خود متعین کرنے کی کوشش کی گئی۔ جب ایک دفعہ کوئی آیت کسی سورت میں موجود اپنے محل سے ہٹادی جائے، تو پھر اس بات میں آزادی محسوس کی جاتی ہے کہ اپنے ذوق کے مطابق اس آیت سے معنی اخذ کرلیے جائیں۔ آخر سورہ فتح جس کا حوالہ پچھلی بحث میں بار بار دیا گیا ہے، اس میں ایسے اختلافات کیوں نظر نہیں آرہے جو سورہ حج کے سلسلے میں نظر آرہے ہیں۔ وجہ صاف ہے کہ جب سورہ فتح اپنے محل سے ہٹائی نہیں گئی، تو اسکے تفسیری اختلافات بھی ایک خاص حد میں ہی رہے، سورہ حج میں معاملہ یکسر مختلف ہوا، سورت کا عمومی انداز اسکو مکی زندگی کے اخری دور کا ظاہر کر رہا ہے، تو مختلف شان نزولیں درمیان کی بعض آیات کو مدینہ کھینچ کر لیجاتی ہیں۔ جب ذہن میں ایک بار بٹھا دیا گیا کہ یہ سورت

منتشر اجزاء کا مجموعہ ہے، اور اسکی آیات کی ترتیب بھی نزولی اعتبار سے وہ نہیں ہے جو کہ مصحف میں موجود ہے، تو لازمی نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ سورت کا مرکزی مضمون کہیں محو ہوجاتا۔ بہت ممکن ہے کہ ابھی بھی کسی کے ذہن میں یہ سوال اٹھے کہ آج کی تاریخ میں اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی، یا دوران ہجرت نازل ہوئی، یا ہجرت کے فوری بعد نازل ہوئی یا حدیبیہ سے پہلے نازل ہوئی، ہمارے لیے تو ایک محکم آیت ہے، اور ہم تو ان چاروں ممکنہ ادوار نزول کے بہت بعد کے ہیں، لہٰذا جب بھی نازل ہوئی ہوتی، ہمارے لیے تو اسکی حیثیت میں فرق نہیں پڑنا تھا۔ اسکا پہلا جواب تو اسی مضمون میں پیش کی گئی چار تفاسیر کے حوالوں سے مل جاتا ہے، مولانا اصلاحیؒ اور مولانا اثریؒ اسکو عمرے اور حج کے ساتھ خاص کرکے بیان کر رہے ہیں، جبکہ مفتی شفیعؒ اور مولانا مودودیؒ ایسا نہیں کر رہے ہیں۔ گویا ان آیات کو اگلی پچھلی آیات سے کاٹ کر انکا زمانہ نزول بدل دینے سے سورت کی تفہیم بدل رہی ہے۔ اور جو سب سے بڑا مسئلہ پیدا ہوا ہے وہ یہ کہ ایسا کرنے سے اس سورت کے مرکزی مضمون سے تفسیر ہٹ جاتی ہے۔ سورت کا بنیادی محور ہی ہجرت کی ترغیب کے ساتھ جہاد کی اجازت ہے، اور یہی آیات (۳۸-۴۱) اس سورت کا محور ہیں۔ جب سورت کا نقطہ ارتکاز ہی اپنی جگہ سے ہلا دیا جائے تو باقی مضامین نے بھی تتر بتر ہونا ہی تھا، جسکی کچھ مثالیں پچھلی آیات میں آئیں، اور کچھ آئندہ آیات میں آئیں گی۔ اور اسکی وجہ یہی ہے کہ اس شان نزول اور اس جیسی دیگر شان نزولوں کو اصل مانتے ہوئے، ہم سورت کو قران کی اکائی اور آیات کو اسکا ذیلی حصہ ماننے کی بجائے، آیات کو قران کی بنیادی اکائی ماننے لگے ہیں، اور پھرسورت کو آیات کا مجموعہ اور قران کو آیات کے مجموعوں کا مجموعہ۔ بعض جگہ تو اس حد تک معاملہ گیا ہے کہ آیت کو بھی اکائی نہیں رہنے دیا گیا ہے، بلکہ آیات میں موجود کسی ذیلی جملے کو اکائی مان لیا گیا ہے۔ اسکی نمایاں ترین مثال الیوم اکملت لکم دینکم ہے، جو کہ سورہ مائدہ کی آیت ۳ کا بھی ایک درمیانہ حصہ ہے، جسکی ایک بالکل جدا شان نزول بیان کی جاتی ہے، بقیہ آیت کا اگلا پچھلا حصہ اس شان نزول کی ذیل میں نہیں آتا، کیونکہ اگر پوری آیت کو ایک اکائی مان لیا جائے، تو ۱۰ہجری کے عرفہ یا اسکے بھی بعد کے کسی دن کو اس کا وقت نزول ماننے پر کئی سوالات اٹھ جاتے ہیں۔ ایسی ہی ایک دوسری مثال سورہ احزاب کی آیت ۳۳ ہے کہ جس میں خطاب ازواج مطہراتؓ سے ہورہا ہے، لیکن جیسے ہی اہل بیت کا لفظ آتا ہے تو روایات کے زیر اثر مان لیا جاتا ہے کہ بیچ آیت میں یکایک مخاطب بدل کر حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور حضرت حسنینؓ ہوگئے ہیں۔ اور جونہی جملہ کا اتنا حصہ مکمل ہوتا ہے تو خطاب واپس ازواج سے شروع ہوجاتا ہے۔ شان نزول کی بنیاد پر تفسیر کی نیو حسن بصری نے اس وقت ڈالی کہ جب انہوں نے کہا کہ حضرت عائشہؓ نے جنگ جمل کے موقع پر بصرہ آکر قرانی حکم "وقرن فی بیوتکن" (احزاب، ۳۳)کی خلاف ورزی کی، حضرت عائشہؓ جب بصرہ آئی تھیں، تو مکہ سے آئی تھیں، نہ کہ مدینہ سے، اگر اس آیت کا وہی مفہوم ہوتا جو کہ حسن بصری بیان کر رہے تھے، تو خلاف ورزی تو مکہ جانے سے بھی ہو گئی تھی، بصرہ تو اسکے بعد کی بات ہے، مزید یہ کہ حضرت عائشہؓ اکیلی تو بصرہ نہیں پہنچ گئی تھیں، ان کے ساتھ کبار صحابہ کرامؓ کی بھی ایک تعداد موجود تھی، گویا وہ سب تو قران کا پیغام بھول گئے، اور بصرہ کے ایک تابعی کو یاد رہا۔ اگرچہ یہ تفسیر آیت کو اپنے محل سے ہٹاکر نہیں کی گئی تھی، محض الفاظ سے کھیلا گیا تھا، لیکن یہ تفسیر سیاسی ورکروں کو اپنے پروپگینڈے کو موثر بنانے کے لیے ایک نئی راہ دکھاگئی کہ قران کریم کا اس مقصد کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔اس کے بعد تو بس شان نزولوں کا جمعہ بازار لگ گیا۔ اقتدار بنو امیہ کے پاس تھا، لہٰذا جہاں جہاں ممکن ہوپاتا تو آیات کی ایسی ایسی شانِ نزولیں بیان کی جاتیں کہ حضرت عائشہؓ اور بنو امیہ نشانے پر آئیں، جبکہ حضرت علیؓ اور پنج تنؓ کی توصیف کا پہلو نکل سکے، اس سے قطع نظر کہ سورت کی آیات اس مبینہ شان نزول کی اجازت دے بھی پارہی ہیں یا نہیں، اگر پوری آیت سے معاملہ کسی طور نہیں بن رہا ہے، تو آیت کو بیچ سے توڑ کر کام نکال لیا جائے۔ جب آیات

کو بیچ سے توڑنے کا نظریہ امت کے ذہن نے ایک دفعہ قبول کرلیا، تو پھر کیا سیاسی کیا غیر سیاسی،ہر طرح کی روایات سامنے آنے لگیں۔ وحی ربانی کو واقعات کا رد عمل بنادیا گیا، کہ ایک وقوعہ ہوا، اسکے لیے فوراً فلاں آیت کا ٹکڑانازل ہوگیا، جسکو بعد میں فلاں سورت کی فلاں آیت کے فلاں حصے میں لگادیا گیا۔ اگر وحی ربانی واقعتاً رد عمل کی ہی نفسیات رکھتی تھی، تو پھرقران کریم کی ایک ایک آیت کے ایک ایک لفظ کی شان نزول معلوم ہونی چاہیے، ورنہ اسکے حقیقی مفہوم ہمیں معلوم ہو ہی نہیں ہو سکتے۔ سوچنے کی بات ہے کہ قران کا غالب ترین حصہ وہ ہے کہ جسکی کوئی شان نزول ہمیں بیان نہیں کی گئی، آخر اسکو سمجھنے کے لیے ہمارے پاس کیا پیمانہ ہے؟ کیا وہ آیات سورت کے ربط سے نہیں سمجھی جاتیں؟ اور ربط تبھی آئے گا، کہ جب کہ یہ مانا جائے کہ جس ترتیب سے یہ سورت میں موجود ہیں، اسی ترتیب سے یہ نازل بھی ہوئی تھیں۔ جب یہ آیات سورت کے ربط سے سمجھی جاسکتی ہیں، تو پھر وہ آیات کیوں نہیں سمجھی جاسکتیں جو کہ شان نزولوں کی بھینٹ چڑھادی گئی ہیں۔

"یقیناً اللہ مدافعت کریگا اُن لوگوں کی طرف سے جو ایمان لائے ہیں، یقیناً اللہ کسی خائن کافرِ نعمت کو پسند نہیں کرتا(۳۸) اجازت دے دی گئی اُن لوگوں کو جن سے لڑائی کی جائے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں، اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے(۳۹) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے صرف اِس قصور پر کہ وہ کہتے ہیں "ہمارا رب اللہ ہے" اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہتا تو خانقاہیں اور گرجا اور کنیسے، اور مسجدیں کہ جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے، سب مسمار کر ڈالی جاتیں، اللہ ضرور اُن لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے(٤٠) یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے(٤١)"

دراصل یہ آیات بھی باقی سورت کی طرح مکی ہی ہیں، اور اسی ترتیب سے نازل ہوئیں جس ترتیب سے یہ سورت میں موجود ہیں۔ یہ پہلے ہی بیان کیا جاچکا ہے کہ پچھلی آیات میں مسجد الحرام سے روکے جانے کا واقعہ حدیبیہ کے موقع کا نہیں ہے، بلکہ ۱۲ نبوی کے حج کے موقع کا ہے۔ قران میں مسجد حرام سے روکے جانے کا ذکر بھی محض انہی دو سورتوں یعنی سورہ فتح اور سورہ حج میں نہیں ہے، بلکہ حدیبیہ (٦ ہجری) سے پہلے نازل ہونے والی بعض دیگر سورتوں میں بھی مسجد الحرام سے روکے جانے کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔ مثلاً ریاست کے مسلمانوں کے لیے جہاد کی عام فرضیت کے سلسلے میں جب سورہ بقرہ (۲ ہجری) نازل ہوئی تو اس میں مشرکین مکہ پر عائد فرد جرم میں مسجد الحرام سے روکنا (آیت ۲۱۷) بھی شامل ہے۔ غزوہ بدر الکبریٰ کے بعد کی صورت حال پر سورہ انفال (رمضان ۲ہجری) میں جب مفصل تبصرہ فرمایا گیا تو اس میں بھی مسجد حرام سے روکنے کا ذکر موجود ہے (آیت ٣٤)۔ غزوہ بدر الآخرہ یا بدرالموعد (ذوالقعدہ ۴ہجری) کے بعد جب سورہ مائدہ نازل ہوئی تو وہاں بھی یہ موضوع زیر بحث آیا ہے (آیت ۲)۔ جب اتنی سورتوں میں یہ بات بیان کی جارہی ہے، اور وہ بھی حدیبیہ سے پہلے، تو کیا وجہ ہے کہ سورہ حج کو حدیبیہ یا اسکے زمانے سے جوڑ دیا جائے جبکہ اس موقع کے حالات پر ایک مکمل سورت (سورہ فتح) بالاتفاق نازل ہوئی بھی ہے۔ اگر اسی ایک موقع کی تفصیل کے لیے سورہ فتح کے ساتھ ساتھ سورہ حج کی بھی بعض آیات نازل ہوئی تھیں، تو واقعات کے متعلق دونوں کے طرز بیان اور احکامات میں میں اتنا فرق کیوں ہوتا۔

۱۲نبوی کے حج کے موقع پر بیعت عقبہ ثانیہ بھی ہوئی، اور بیعت عقبہ اولیٰ کے برخلاف اس موقع پر جنگ کے لیے تیار رہنے کا حلف لیا گیا تھا، اسی موقع پر یہ بھی فیصلہ ہوا کہ اب رسول اللہ □ مدینہ ہجرت کر جائیں گے۔ اس بیعت کے بعد صحابہ نے مدینہ کی جانب ہجرت شروع کردی تھی،

جسکی ابتداء حضرت أبو سلمہؓ نے کی۔ مکی صحابہؓ کی تربیت کو ایک زمانہ بیت چکا تھا، اسلامی تحریک کے نشیب و فراز سے وہ خود گزرے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے جہاد کی اجازت بھی ابتداً صرف انہی مکی مسلمانوں کو دی جو کہ مدینہ ہجرت کرجائیں۔ ابتدائی غزوات و سرایا میں اسی وجہ سے صرف مہاجرین کی شمولیت کا ذکر ملتا ہے، مثلاً صفر ٢ ہجری میں ہونے والا غزوہ ودان، اور ربیع الأول ٢ہجری میں ہونے والا غزوہ بواط میں رسول اللہ محض مہاجرین کو لیکر نکلے تھے، ان غزوات کے علاوہ کئی ابتدائی سرایا بھی ہیں کہ جن میں محض مہاجرین نے ہی حصہ لیا تھا۔ اور یہ سورہ حج آیت(٣٩) کے مطابق ہی ہورہا تھا۔

جو لوگ سورت کی اندرونی شہادتوں پر اسکے زمانہ نزول کے تعین کی بجائے محض روایات کے آئینہ میں ہی سورت کی مختلف آیات کی تفسیر کرنے کے قائل ہیں، تو اس سلسلے میں بھی متعدد روایات مل جاتی ہیں جو کہ سورہ حج کی اس آیت کو مکی دور کے آخر کا ہی مانتی ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ سعید بن جبیر کی روایت کی بازگشت اتنی سنائی دی گئی ہے کہ یہ روایات اُس کے آگے مدھم پڑ گئی ہیں۔ ابن ابی حاتمؒ اپنی تفسیر میں حضرت عروہؒ بن زبیرؓ کے حوالے سے روایت کرتے ہیں:

"یہ پہلی آیت قتال کے بارے میں نازل ہوئی جب مسلمان کفار کے ہاتھوں مکہ میں تکلیف میں پڑے ۔ ان کے خاندان کے لوگ ہی ان کے درمیان حائل ہوئے تاکہ وہ اسلام سے پھرجائیں اور ان کو ان کے گھروں سے نکال دیں اور ان پر غلبہ حاصل کرلیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت (حج، ٣٩) نازل فرمائی۔ آیت اذن للذین یقتلون بانہم ظلموا۔ اور یہ حکم اس وقت ہوا جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نکلنے کی اجازت دی اور ان کو لڑنے کی بھی اجازت دی۔"

١٢ نبوی کے حج کے بعد جو ماحول تھا، اور جس میں مسلمانان مکہ نے بتدریج مدینہ کی جانب ہجرت شروع کی، یہ روایت اسی ماحول کی عکاسی کر رہی ہے۔ ہجرت کوئی ایک دن کا عمل نہیں تھا کہ سب مسلمان بشمول نبی پاک ایک ساتھ مکہ سے نکل گئے، لہٰذا اگر اس قیاس کی بنیاد پر یہ دلیل لی جائے کہ یہ آیات لازماً نبی کریم کی ہجرت کے بعد نازل ہونی چاہیے، ورنہ آیت کا متن ٹکراجاتا ہے، درست نہیں ہے۔ حالانکہ آیت ٤١ پر غور کیا جائے تو یہ خود واضح ہوجاتا ہے کہ یہ آیات ہجرت کے عمل کے آغاز کے ضرور بعد نازل ہوئی ہیں، تاہم نبی کریم کی ہجرت ابھی نہیں ہوئی ہے۔ ہجرت کی ابتداء تو بیعت عقبہ اولی (١١ نبوی) سے ہی شروع ہو گئی تھی ، کہ جب حضرت مصعبؓ بن عمیر کو مدینہ والوں کی تربیت کے لیے انکے ساتھ روانہ کیا گیا۔ عمومی ہجرت اگرچہ اسکے بعد شروع ہوئی، تاہم رسول اللہ ہجرت کرکے مدینہ جانے والوں میں آخری لوگوں میں سے تھے۔ آخر جب ایک روایت سورت کے عمومی ماحول کے مطابق ہی بات بیان کر رہی تھی، تو اس کو چھوڑ کر سعید بن جبیر کی روایت کو فوقیت دینے کی دلیل کیا تھی، جبکہ وہ اس سورت کے لیے یحرفون الکلمۃ عن مواضعۃ والا کام ہی کر رہی تھی، اور اسکو مانتے ہوئے بھی تفسیر کرنے کا جو نتیجہ نکلا ہے، اسکی چند مثالیں اسی مضمون میں ابھی گزری ہی ہیں۔ عروہؒ بن زبیرؓکے حوالے سے یہ روایت اس موضوع پر اکیلی نہیں ہے۔ تفسیر درمنثور میں امام سیوطیؒ ابن زیدؒ کے حوالے سے روایت کرتے ہیں:

"مسلمانوں کو ان کافروں سے لڑنے کی اجازت دے دی گئی۔ ان سے دس سال درگذر کرنے کے بعد"

یہ روایت بھی اس آیت کے بالکل آخری مکی دور کے ہونے کی تصدیق کر رہی ہے۔ مکی زندگی کے ساڑھے بارہ سالوں میں مشرکین کی طرف سے مخالفت پہلے ہی دن شروع نہیں ہو گئی تھی، ابتداً تو تبلیغ کا بھی بہت محدود حلقے میں ہی سلسلہ شروع ہوا تھا، مشرکین کی طرف سے مخالفت تبھی شروع ہوئی جبکہ عام دعوت کا سلسلہ شروع ہوا۔

حضرت عمرؓکی ہجرت کے متعلق اگرچہ دو واقعات مشہور ہیں، تاہم ان میں سے ایک میں بیان کیا گیا ہے کہ اپنی ہجرت والے دن تلوار حمائل کیے، پہلو میں نیزہ باندھے، پشت پر ترکش لگائے، ہاتھ میں کمان لیے بیت اللہ آئے، جہاں اس وقت کفار کی کئی ٹولیاں موجود تھیں۔ سب سے پہلے انہوںؓ نے کعبۃ اللہ کا سات بار طواف کیا پھر مقام ابراہیمؑ پر دو رکعت نماز ادا کی، بعد ازاں حلقہ مجلس میں کھڑے ہوکر مشرکین سے مخاطب ہوکر فرمایا:"تمہارے چہرے مسخ ہوں، تمہاری ناک خون آلود ہو، جو شخص چاہتا ہے کہ اپنی ماں کو پیچھے روتا ہوا چھوڑے، اپنی بیوی کو بیوہ بنائے اور اپنے بچوں کو یتیم ہونے دے، وہ حرم سے باہر آکر مجھ سے جنگ کرلے، میں ہجرت کرکے مدینہ جارہا ہوں، اگر کسی میں دم خم ہو تو روک کر دکھائے"۔ اہل قریش میں سے کسی کے بولنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ زبان سے کوئی جملہ نکالے یا آگے بڑھ کر روکنے کی کوشش کرے، انکے خاندان کےکئی وہ لوگ جو تنہا مشرکین کا مقابلہ نہیں کر پارہے تھے، وہ بھی ساتھ ہولیے، جن میں انکی دختر حضرت حفصہؓ، انکے شوہر حضرت خنیسؓ بن حذافہ، چچا زاد حضرت سعیدؓ بن زید سمیت بیس افراد شامل تھے۔ حضرت عمرؓنے مدینہ ہجرت رسول اللہ سے قبل کی ہے، اگر تو آیت ۳۹ کا نزول رسول اللہ کے سفرِ ہجرت کے دوران ہوا ہوتا تو آخر کس دلیل پر حضرت عمرؓمشرکین کو یہ چیلنج دے سکتے تھے کہ جو مجھے ہجرت سے روکنا چاہے وہ حرم کے باہر آکر مجھ سے جنگ کرلے۔ ظاہر ہے جب وہ مدینہ کے قصد سے حدود حرم سے نکل جاتے تو وہ مہاجر ہوجاتے اور پھر اس آیت کی رو سے ان پر جنگ کرنے کی اجازت کا بھی اطلاق ہوجاتا تھا۔

سیرت نبویؐ کی ابتدائی کتاب ابن ہشام (ابن اسحق) اس آیت(۳۹) کو مکی دور کے بالکل آخر کا اس طرز پربیان کر رہی ہے کہ جیسے اس نےسعید بن جبیر کی روایت کو بالکل آخری درجہ میں جاکر مسترد کردیا ہو۔ اور ان سب سے بڑھ کر اس سورت کے مکی دور کے ہونے کے لیے سب سے بڑی شہادت خود سورہ حج کی ایک اگلی آیت(۵۸) میں موجود ہے کہ جس میں ہجرت کی ترغیب دلائی جارہی ہے۔ کیا یہ بات بالکل واضح نہیں کردیتی کہ ہجرت کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے، اور باقی مسلمانوں کو بھی اس کے لیے ابھارا جارہا ہے۔

غزوہ بدر(رمضان ۲ہجری) سے پہلے مہاجرین مکہ نے کئی غزوات و سرایا میں حصہ لیا تھا، اور یہ ہجرت کے سال سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ مدینہ کے مقامی لوگ بھی اللہ کے رسولؐ کے حضور مسلسل اس خواہش کا اظہار کر رہے تھے کہ کب انکے لیے بھی جہاد کی اجازت نازل ہوگی۔ اسکے بعد جب سورہ البقرہ نازل ہوئی تو اس میں ارشاد ہوا: " اور تم اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو، جو تم سے لڑتے ہیں۔۔"(سورہ بقرہ، آیت ۱۹۰)۔ اس آیت میں قتال کا حکم عام تھا، اس کے بعد جب وہ حالات پیدا ہوئے جن میں غزوہ بدر وقوع پذیر ہونے جارہی تھی، اور مکہ سے ہزار افراد کا لشکر مدینہ کی جانب چل پڑا تھا، تو بعض لوگوں کی کیفیت سورہ محمد آیت ۲۰ میں اس طرح بیان کی گئی:" جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ کوئی سورت کیوں نہیں نازل کی جاتی (جس میں جنگ کا حکم دیا جائے) مگر جب ایک محکم سورت (سورہ بقرہ) نازل کر دی گئی جس میں جنگ کا ذکر تھا تو تم نے دیکھا کہ جن کے دلوں میں بیماری تھی وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت چھا گئی ہو افسوس اُن کے حال پر" (سورہ محمدؐ، آیت ۲۰، نزول ۲ ہجری)۔
سورہ محمدؐ کی اس آیت میں "محکم سورت" کے الفاظ پر غور کیا جائے، تو سورہ حج کی اس آیت(۳۹) کے سلسلے میں سعید بن جبیر کی روایت کی پوری قلعی کھل جاتی ہے۔ مہاجرین کو تو سورہ حج کی اسی آیت(۳۹) میں جہاد کی اجازت مل گئی تھی، اور اسکے مطابق وہ بعض غزوات و سرایا انجام بھی دے چکے تھے۔ سورہ محمدؐ کی درج بالا آیت(۲۰) میں جب مدینہ کے بعض لوگوں کا مکالمہ بیان ہوا ہے، تو بتایا گیا ہے کہ وہ لوگ سورہ بقرہ کے نزول سے پہلے مطالبہ کر رہے تھے کہ آخر سب لوگوں کے لیے جہاد کے حکم سے متعلق کوئی "سورت" کیوں نازل نہیں ہورہی۔ گویا

"سورت" کے نزول کی خواہش کااظہار ہورہا ہے۔ اگر سورہ حج کی آیات ایسے ہی منتشر طریقے سے نازل ہوئی ہوتیں، جیسا کہ سعید بن جبیر کا بیان ہے، یا اس کے اثر میں آج کی مسلم امہ کے سواد اعظم کا ماننا ہے، تو مدینہ والوں کی طرف سے یہ خواہش ہر گز نہیں آتی کہ جہاد کے حکم کے سلسلے میں کوئی "سورت" کیوں نازل نہیں ہوتی، اس صورت حال میں انکی طرف سے یہ بات کہی جانی چاہیے تھی کہ آخر جہاد کے حکم کے سلسلے میں کوئی "آیت" کیوں نازل نہیں ہوتی کیونکہ سعید بن جبیر کے مطابق اس آیت(حج، ۳۹) کا نزول تو انفرادی حیثیت میں ہوا تھا۔ ظاہر ہے مدینہ والے اگر سورت کے نزول کی خواہش رکھتے تھے، تو وہ پہلے سے نازل کسی سورت کی روشنی میں یہ خواہش رکھتے تھے، اور وہ نازل شدہ سورت سورہ حج تھی- اگر سورہ حج کی آیات بس یونہی سفر، حضر، لیل، نہار، مکہ، مدینہ میں نازل ہوتی رہی ہوتیں، تو سورہ محمدؐ کی آیت(۲۰) کا متن وہ ہرگز نہ ہوتا جو کہ ہے۔ سورہ محمدؐ کی آیت(۲۰) میں "آیت کی بجائے سورت" کے نزول کے مطالبہ کا لفظ ہمارے لیے قران کو سمجھنے کے لیے ایک بہت اہم تنبیہ اور رہنمائی ہے کہ کسی بھی سورت کا نزول ایک مخصوص دور میں بیک وقت یا مختلف تقاریر کی صورت میں ہوتا تھا، اس کی آیات ۲۳ سال کے طویل عرصے تک بکھری نہیں پڑی رہتی تھیں، جیسا کہ ان نام نہاد مروجہ شان نزولوں نے ہمارے ذہنوں میں اس نظریہ کو انتہائی گہرائی تک پیوست کردیا ہے۔ لہٰذا سورت کے مضمون کو اگر سمجھنا ہے تو اسکی آیات کے باہمی ربط سے سمجھا جائے، نہ کہ بعد میں بیان کی گئی روایات کے آئینہ میں کہ جو آیات کو سورت کے جز کی بجائے اپنے اندر ایک اکائی یا علیحدہ مضمون بنادیتی ہیں، جبکہ بعض جگہ تو معاملہ آیت پر بھی نہیں روکا گیا ہے، بلکہ دوران آیت چند الفاظ کو بھی ایک جدا موضوع مان لیا گیا ہے۔ سورہ محمدؐ کی آیت (۲۰) کی روشنی میں اب جب کہ ہر سورت ایک بنیادی موضوع یا موضوعات لیکر کسی مخصوص دور یا زمانے میں نازل ہوئی ہوتی تھی، تو اگراس کے دور نزول کا درست تعین کرلیا جائے، اور پھر اس دور کے حالات کی روشنی میں سورت کے مضمون کو سمجھا جائے تو اسکی تفہیم میں مزید آسانی پیدا ہوسکتی ہے، بصورتِ دیگر چار تفاسیر کے أحوال اسی آیت(۳۹) کے ذیل میں بیان کردیے گئے ہیں۔

آگے چل کر آیت(٤٠) میں جب ان مکہ والوں کو جہاد کی اجازت دی جارہی ہے تو فرمایا گیا ہے کہ وہ لوگ جو یہ کہنے کی پاداش میں کہ اللہ ایک ہے اپنے گھروں سے نکالے گئے۔ "نکالے گئے" کا مفہوم یہاں یہ نہیں ہے کہ انکو ہاتھ پکڑ کر یا دھکے دیکرنکال دیا گیا تھا، بلکہ یہ ہے کہ مکہ کی سرزمین پر حالات ایسے پیدا کردیے گئے تھے کہ موحدین کے لیے دین پر چلتے ہوئے رہنا محال کردیا گیا تھا۔ ہجرتِ مدینہ سے پہلے ایک ہجرت حبشہ کی جانب بھی کی جاچکی تھی۔ تاریخی طور پر بھی جو شواہد موصول ہوتے ہیں وہ اسی دوسرے مفہوم کی گواہی دیتے ہیں، کیونکہ کوشش یہی کی جارہی تھی کہ مسلمانوں کو اول تو نکلنے نہ دیا جائے، اور وہیں ظلم کی چکی میں پیسا جائے، اور جو کوئی نکل رہا تھا، تو اسکے مکانوں اور جائیدادوں پر قبضہ کیا جارہا تھا، گویا معاشی طور پر بھی ایک جنگ جاری تھی۔ خود رسول اللہ کی ہجرت سے عین قبل انکے خلاف دارالندوہ میں ہونے والی میٹنگ کی منظر کشی قران کریم نے ان الفاظ میں کی ہے "وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جبکہ منکرینِ حق تیرے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے کہ تجھے قید کر دیں یا قتل کر ڈالیں یا جلا وطن کر دیں وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چال چل رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے"(انفال،۳۰)، گویا آخر تک بھی مشرکین یہ فیصلہ نہیں کر پارہے تھے، کہ اسلام کے خاتمہ کے لیے کونسی حتمی تدبیر اختیار کرنی ہے، اور پھر یہ فیصلہ ہوا کہ رسول اللہ کو اگر تمام قبائل مل کر قتل کردیں گے، تو انکا خاندان بدلہ لینے کے قابل نہیں رہے گا، اور خوں بہا دیکر معاملہ کو نمٹا لیا جائے گا؛ حضرت ابوبکرؓ کی معیت میں جب رسول اللہ نے ہجرت کی، تو ابتداء میں شمال (مدینہ) کی بجائے جنوب (غار ثور) کا رخ کیا، اور تین دن وہیں قیام کیا تاکہ مکہ والے جو

ڈھونڈ مچائے ہوئے ہیں، اس میں کمی آجائے، اور پھر جب کفار کھوہ کے دہانے تک پہنچ گئے، تو اس وقت کی منظر کشی قران ان الفاظ میں کرتا ہے "۔۔۔اللہ اُسؐ کی مدد اس وقت کر چکا ہے جب کافروں نے اسے نکال دیا تھا، جب وہ صرف دو میں کا دوسرا تھا، جب وہ دونوں کھوہ میں تھے، جب وہ اپنی ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ "غم نہ کر، اللہ ہمارے ساتھ ہے" اُس وقت اللہ نے اسؐ پر اپنی طرف سے سکون قلب نازل کیا اور اس کی مدد ایسے لشکروں سے کی جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور کافروں کا بول نیچا کر دیا (بدر اور پھر فتح مکہ کی صورت میں) اور اللہ کا بول تو اونچا ہی ہے، اللہ زبردست اور دانا و بینا ہے" (سورہ توبہ، ٤٠)؛ سورہ حج کی آیت ٤٠ میں ہی آگے چل کراللہ تعالیٰ اپنی اسی سنت کا ذکر کر رہا ہے کہ ظلم جب حد سے بڑھتا ہے تو مٹادیا جاتا ہے اور اللہ ظالم قوم کی سرکوبی کے لیے دوسری قوم اٹھادیتا ہے۔ ظاہر ہی بات ہے کہ دوسری قوم اٹھائے جانے کا ظاہری سبب مسلمانوں کو جہاد کی اجازت دیدینا تھا۔ أولاد ابراہیمؑ ہونے کے ناطے مشرکین مکہ نے اپنی ان ذمہ داریوں کا درست ادراک نہیں کیا تھا کہ جو مسجد حرام کے حوالے سے ان پر عائد ہوتی تھیں (آیت ٢٥،٢٦)، تو اب اللہ مدینہ منورہ میں کلمہ کی بنیاد پر ایک نئی قوم اٹھارہا تھا، جہاں مہاجرین مکہ اور قحطانی الأصل انصاریوں کے ملاپ سے امت وسطیٰ کی تشکیل شروع ہورہی تھی۔ مشرکین مکہ اگر رکاوٹ بننے کی کوشش کریں گے تو تنبیہ کے طور پر ان کو یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کا إحساس کچھ سابقہ امتوں کے حوالے سے دیا ہے کہ اگر اللہ کا نام مٹادینا ظالموں کے بس میں ہوتا تو یہود و نصاریٰ (جو کہ بہرحال ساری تحریفات کے باوجود بھی اب تک نظری طور پر اپنے آپکو موحد ہی مانتے تھے) کب کے قصہ پارینہ بن چکے ہوتے۔ یہاں یہود و نصاریٰ کی عبادت گاہوں خانقاہوں، گرجوں، کنیسوں اور مسجدوں کا ذکر بھی اسی طرف توجہ دلانے کے حوالے سے کیا گیا ہے کہ دیکھو ان عبادت گاہوں کو جہاں اللہ کا نام کثرت سے لیا جارہا ہے اور تمام ظلم و جبر سہنے کے بعد بھی اب تک قائم ہیں۔ یہاں موحد عبادت گاہوں کا خصوصی ذکر اس لیے بھی ہے، کیونکہ ایک پچھلی آیت میں مسجد الحرام کے قیام کا مقصد بھی بیان کیا گیا تھا کہ جہاں ایک اللہ کی عبات ہو، "یاد کرو وہ وقت جب ہم نے ابراہیمؑ کے لیے اِس گھر (خانہ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی (اِس ہدایت کے ساتھ) کہ "میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو۔۔"(حج،٢٦)، جبکہ صورت حال یہ کردی گئی تھی، کہ باقاعدہ بیت اللہ کو بت خانہ بنادیا گیا تھا، اور اب جو مسلمان ایک رب کی عبادت کے لیے اسرار کر رہے تھے، تو ان پر سماجی، معاشی، جسمانی، نفسیاتی، ہر لحاظ سے جنگ مسلط کردی گئی تھی۔ گویا اب جو مسلمانوں کو جہاد کی اجازت دی گئی ہے، تو اسکا منطقی انجام بیت اللہ کی تطہیر کے ہونے کا اشارہ دیدیا گیا ہے۔

پچھلی امتوں کے حوالے سے مشرکین کو غور کرنے کی دعوت میں یہودیوں اور عیسائیوں کی دیگر عبادت گاہوں کے آخر میں مساجد کے ذکر کی کافی تاویلات پیش کی گئی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ان عبادت گاہوں کے ذکر کے فوری بعد جب یہ فرمایا گیا ہے کہ "جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے"، یہ صرف مساجد کی صفت کے طور پر بیان ہوا ہے، حالانکہ دیکھا جائے تو یہودی یا اُس دور کے کئی موحد عیسائی بھی اسی ایک رب کی عبادت کرتے تھے جس کی مسلمان کرتے ہیں، تو اللہ کا نام لیے جانے کو محض مسلمانوں کی عبادت گاہوں کی صفت مان لینا درست بات نہیں لگتی۔ امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے "اگر یہ کہا جائے کہ ذمیوں کی مساجد کو مسلمانوں کی مساجد سے پہلے کیوں ذکر کیا گیا ہے تو کہا جائے گا کہ وہ بنا میں مقدم ہیں"۔ لیکن اگر زمانی ترتیب کے مطابق ہی ذکر کیا گیا ہوتا تو پھر یہود کی عبادت گاہوں کا ذکر عیسائیوں کی عبادت گاہوں سے پہلے ہونا چاہیے تھا، جو کہ آیت کے بیان کے مطابق ترتیب نہیں ہے۔ آیت میں تو عیسائیوں کی خانقاہوں اور گرجوں کا ذکر یہودیوں کے کنیسوں سے پہلے کیا گیا ہے، جبکہ عیسائیت حضرت موسیٰؑ کے کم از کم چودہ سو سال بعد ظہور پذیر ہوئی۔ امام ابن کثیرؒ نے یہی بات ایک دوسرے طریقے سے بیان

کی ہے۔ فرماتے ہیں "اس آیت میں اقل سے اکثر کی طرف ترقی کی صنعت رکھی گئی ہے، پس سب سے زیادہ آباد، سب سے بڑا عبادت گھر جہاں کے عابدوں کا قصد صحیح نیک نیت، عمل صالح ہے، وہ مسجدیں ہیں"۔ اس دلیل میں بھی جو سوال اٹھتا ہے وہ یہ کہ پھر تو یہ مانا جائے نیک نیتی اور عمل صالح میں یہودی پھر عیسائیوں سے آگے تھے، کیونکہ اقل سے اکثر کی طرف بڑھتی صنعت میں انکی عبادت گاہ(وں) کا ذکر عیسائیوں کی عبادت گاہوں کے بعد میں آیا ہے، حالانکہ قرآن کا طرز بیان تو یہ ظاہر کر رہا ہے کہ خشیت الٰہی میں یہودی قوم عیسائیوں سے پیچھے تھی۔ مولانا اصلاحیؒ تدبر قران میں ایک نئی توجیح پیش کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں: "ہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ آیت میں سب سے پہلے --- نصاریٰ کی خانقاہوں اور ان کے گرجوں کا ذکر ہے۔ سب سے پہلے ان کی طرف اشارہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے جذبہ جہاد پر سب سے زیادہ معترض، جیسا کہ سورۃ حدید کی تفسیر سے معلوم ہوگا۔ نصاریٰ ہی تھے۔ --- ان کے رہبانی تصور کو اس میں بڑا دخل تھا۔ قرآن نے ان کے اسی تصور پر یہاں ضرب لگائی ہے کہ اسلام کی مخالفت کے جوش میں جو لوگ جہاد کو دینداری کے خلاف قرار دے رہے ہیں وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہ کریں کہ اگر دینداری کا یہی تصور پہلے بھی ہوتا تو آج زمین پر خدا کی عبادت کا ایک گوشہ بھی محفوظ نہ ہوتا۔" مولانا اصلاحیؒ کی اس بات کی تائید قرآن سے نہیں ہوتی کیونکہ قرآن تو یہود اور مشرکین کے برخلاف عیسائیوں کو مسلمانوں کے خلاف زیادہ شدید بیان نہیں کر رہا ہے۔ سورہ مائدہ میں ارشاد ہوتا ہے:

"تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے، اور ایمان لانے والوں کے لیے دوستی میں قریب تر اُن لوگوں کو پا ؤ گے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں یہ اِس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور اُن میں غرور نفس نہیں ہے"(سورہ مائدہ،۸۲)

اس آیت میں تو عیسائیوں کا مسلمانوں کے حق میں یہود و مشرکین کے مقابلہ میں بہتر ہونے کی بنیادی وجوہ میں یہی خانقاہ نشین بھی بیان ہوئے ہیں، جن کو اصلاحیؒ صاحب سب بڑا معترض بیان کر رہے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ انہی آیات کو مولانا اصلاحیؒ ہجرت کے فوری بعد کا مانتے ہیں، اور یہی وہ پہلی آیات بھی ہیں، کہ جن میں جہاد کا اجازت نامہ ملا۔ اب جب کہ جہاد کی ابتداء ہوئی ہی نہیں تھی، تو عیسائی رہبان کی طرف سے جہاد کے حوالے سے اسلام پر اعتراض کی وجہ بنتی ہی نہیں تھی۔ اگر تو یہ آیات کئی جنگوں کے بعد نازل ہوئی ہوتیں، تو پھر تو یہ دلیل لی بھی جاسکتی تھی، لیکن اس صورت میں آیت (۳۹) کا کیا کیا جائے گا، کہ جو جہاد کے حکم کے متعلق قران کریم کی پہلی آیت ہے۔

اس سوال کی طرف تو بعد میں آیا جائے گا کہ مساجد کا ذکر سب سے آخر میں کیوں ہوا ہے، لیکن پہلے اس بات کو دیکھا جانا چاہیے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کی عبادات گاہوں کی اس آبادی میں کس طرح ظالم قوموں کو دیگر اقوام سے دفع کیا گیا ۔ آیت میں فرمایا گیا ہے "--- اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہتا تو خانقاہیں اور گرجا اور کنیسے اور مسجدیں، جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے، سب مسمار کر ڈالی جاتیں؛ اللہ ضرور اُن لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے؛ اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے" (حج، ٤٠)

یہودیوں کی تاریخ پر غور کیا جائے تو بخت نصر وہ شخص تھا کہ جس نے بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجادی، یہودیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح بابل لے گیا، اس حد تک ظلم کیا گیا کہ وہ لوگ اپنی زبان تک بھولنے لگے، لیکن اللہ نے ایک دوسری قوم اٹھادی، اللہ تعالیٰ نے خسرو کے ذریعے بابلیوں کی شکست کے بعد یہودیوں کو دوبارہ پنپنے کا موقع ملا۔ عیسائیوں پر بھی ابتداً رومیوں نے انتہائی مظالم ڈھائے، لیکن پھر وہ وقت بھی آیا جب بازنطین کے مقام پر مشرقی رومی

سلطنت منظم ہوئی اور عیسائیت قبول کرلی۔ لیکن ان تین ساڑھے تین سو سالوں میں بھی ریاستی قوت کے باوجود بھی رومی مشرکین ملک سے عیسائیت کو محو نہیں کر سکے۔ گویا عیسائیوں اور یہودیوں کے معاملے میں تو اللہ تعالیٰ نے دیگر اقوام کو اٹھاکر ظالموں کو پسپا کردیا تھا، اور اس بات کا حوالہ مشرکین مکہ کو دیدیا گیا، لیکن اس بار خود مسلم امہ کو ظالموں کی سرکوبی کے لیے اٹھایا جارہا تھا، اور پچھلی اقوام کا حوالہ دیے جانے سے پہلے مسلمانوں کو جہاد کی اجازت دیکر واضح بھی کردیا۔

غور طلب بات یہ ہے کہ موحدین کی پچھلی عبادت گاہوں کا حوالہ جب دیا گیا ہے، تو اس حیثیت میں دیا گیا ہے کہ اگر دوسری قومیں نہ اٹھائی جاتیں تو ان عبادت گاہوں میں اللہ کا نام لینا ختم ہوجاتا، گویا جملے کی ساخت بیان کر رہی ہے کہ پہلے سے موجود عبادت گاہوں کی بقاء کے لیے ظالم قوموں کی سرکوبی دیگر اقوام کے ذریعے سے کی گئی، لیکن اگر مسلمانوں کی بات کی جائے، تو انکی عبادت گاہوں کی آبادکاری تو درست معنوں میں ہوئی ہی ہجرت کے بعد تھی، یعنی اگر ہجرت نہ ہوتی، تو ان عبادت گاہوں کا تو وجود ہی نہیں ہوتا۔ گویا پچھلی قوموں کے برخلاف کفار کی سرکوبی کے لیے اٹھائی جانے والی قوم کی بدولت مسلمانوں کی مساجد قائم ہوئی تھیں۔ اسلامی تاریخ کی پہلی مسجد کی نیو ہجرت کے بعد قباء میں قیام کے دوران رسول اللہ نے رکھی، اور اس کے بعد مسجد نبویؐ کی بنیاد رکھی گئی۔ گویا جس وقت یہ آیات نازل ہوئی تھیں، اس وقت مسلمانوں کی مساجد کا تو وجود ہی نہیں تھا۔ تو پھر جب یہاں مساجد کا ذکر کیا گیا ہے، تو اس سے مراد کون سی عبادت گاہیں ہیں، کیا یہاں مساجد سے واقعتاً مسلمانوں ہی کی عبادت گاہیں مقصود ہیں یا کچھ اور؟جہاں تک خانقاہوں اور گرجوں کا سوال ہے تو وہ تو نصاریٰ کی عبادت گاہیں ہوئیں، خانقاہیں وہ جگہیں جہاں عیسائیوں کے رہبان دن رات عبادت میں اپنے آپ کو مشغول رکھتے تھے، جبکہ گرجا گھروں میں عام لوگوں عبادت کے لیے آتے تھے، اور اتوار کے روز نسبتاً بڑی تقریب منعقد ہوتی تھی۔ کنیسے وہ جگہیں ہیں جہاں یہود توریت کا پاٹ کرتے تھے اور دعائیں وغیرہ بھی، اور آیت میں کنیوں کے بعد مساجد کا ذکر ہے۔ ۔ کلام اللہ ایک آفاقی کتاب ہے۔ آج کے تناظر میں دیکھا جائے تو یقیناً مساجد وہی جگہیں ہیں جہاں مسلمان اللہ کے حضور سربسجود ہوتے ہیں، اور اس آیت سے مطلب یہ اخذ ہوگا کہ اگر دنیا کہ کسی خطے میں مسلمانوں کو بالکل نابود کرنے کی کوشش کی گئی تو اللہ کسی اور جگہ انکے پنپنے کے أسباب پیدا فرمادیگا۔ لیکن جس وقت یہ آیات نازل ہورہی تھیں، تو مسلمانوں کی مساجد کا وجود کدھر تھا؟ یہاں دراصل یہودیوں ہی کی ان عبادت گاہوں کا ذکر ہورہا ہے جہاں وہ نماز پڑھا کرتے تھے، اور اس نماز میں سجدہ بھی ہوتا تھا۔ قرون وسطیٰ تک بھی یہود میں کسی حد تک مسلمانوں کی مانند نماز کا طریقہ رہا ہے، جو کہ آہستہ آہستہ متروک ہو چکا ہے، البتہ یوم غفران (یہودی مہینے تشری کی ۱۰ تاریخ) کو آج کے دور میں بھی رکوع و سجود والی نماز پڑھی جاتی ہے۔ خود قران یہود کی عبادت گاہوں کے لیے سورہ حج سے کچھ پہلے نازل ہونے والی سورہ بنی اسرائیل میں مسجد کا لفظ استعمال کر چکا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:"(اے بنی اسرائیل)تم نے بھلائی کی تو وہ تمہارے اپنے ہی لیے بھلائی تھی، اور برائی کی تو وہ تمہاری اپنی ذات کے لیے برائی ثابت ہوئی پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا (۷۰عیسوی) تو ہم نے دوسرے دشمنوں (ٹائیٹس)کو تم پر مسلط کیا تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور "مسجد" (بیت المقدس) میں اُسی طرح گھس جائیں جس طرح پہلے دشمن گھسے تھے اور جس چیز پر ان کا ہاتھ پڑے اُسے تباہ کر کے رکھ دیں (سورہ بنی اسرائیل، آیت ۷)

سورہ بنی اسرائیل سورہ حج سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ اگرچہ قران کی اس دلیل کے آگے کسی دوسری دلیل کی حاجت تو نہیں ہے تاہم بعد کے ادوار میں بھی عربی زبان میں مسجد کا لفظ اس مفہوم میں استعمال ہوا ہے، مثلاً اسی آیت کی تفسیر کرتے وقت جب امام قرطبیؒ مسجد کا لفظ کنیسوں اور

دیگر عبادت گاہوں کے بعد استعمال کرتے ہیں تو انہوں نے یہود و نصاریٰ کی عبادت گاہوں کے لیے بھی مسجد ہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

لم قدمت مساجد اهل الذمۃ و مصلیاتهم علیٰ مساجد المسلمین؟

یہاں ذمیوں کی عبادت گاہوں کے لیے مساجد کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ آیت میں موجود مساجد کے لفظ کی اس وضاحت کے بعد اب ان توجیحات کی بھی ضرورت نہیں رہتی جو کہ قرطبیؒ، ابن کثیرؒ یا اصلاحیؒ صاحبان کے حوالے سے پیش کی گئی ہیں۔ آیت خود واضح کر رہی ہے کہ یہاں یہ ترتیب کس واسطے رکھی گئی ہے۔ آیت میں ان عبادت گاہوں کا ذکر اللہ کا نام لینے کے حوالے سے ہوا ہے۔ اور لازماً صنعت بھی اکثر سے اقل کی طرف بڑھتی ہے، عیسائی یہود کے مقابلے میں تعداد میں بھی زیادہ تھے، اور عبادت گزار بھی، خانقاہوں میں ذکر الہیٰ مسلسل جاری رہتا تھا، جبکہ گرجوں میں یہ مخصوص اوقات میں، جبکہ اتوار کے دن اس میں اضافہ ہوجاتا تھا، کنیسے یہود کے یہاں مساجد سے زیادہ آباد رہے ہیں، بلکہ رکوع و سجود والی نماز تو ان کے یہاں آہستہ آہستہ نایاب ہی ہوتی گئی ہے۔ گویا جو عبادت گاہ جتنا زیادہ ذکر الہیٰ میں شامل تھی، اسی کا ذکر سب سے پہلے آیا ہے۔

آگے آیت (٤١) میں ارشاد ہورہا ہے کہ " یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں دنیا میں حکومت دے دیں تو نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور نیک کام کا حکم کریں اور برے کاموں سے روکیں اور ہر کام کا انجام تو اللہ کے ہی ہاتھ میں ہے (٤١)۔

یہاں کن لوگوں کی بات ہورہی ہے؟ آیت ٣٩میں ارشاد ہوا کہ اجازت دیدی گئی جنگ کرنے کی، آیت ٤٠میں فرمایا گیا کہ یہ اجازت ان لوگوں کو کہ جو اپنے گھروں سے نکالے گئے (یعنی کہ مہاجرین مکہ)، اور آیت(٤٠) کی روشنی میں ہی جب ابتداً کئی غزوات و سرایا لڑے گئے کہ تو کوئی انصاری شامل نہیں تھا۔ اب انہی لوگوں کی ایک مزید خصوصیت اس آیت (٤١) میں بیان کی جارہی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انکو دسترس حاصل ہو جائے تو آیت میں بیان کردہ افعال سرانجام دیتے رہیں گے، اس کے بعد ان سے انحراف نہیں کریں گے۔ رسول اللہ کو تو مدینہ جاتے ہی اقتدار مل گیا تھا، اور وہ یہ کام سب سے زیادہ احسن طریقہ پر انجام دینے والے تھے۔ تو آخر پھر کس دلیل پر یہ بات مانی جائے کہ یہ آیات (٣٨-٤١) مدینہ جاکر یعنی کہ رسول اللہ کی ہجرت کے بھی بعد نازل ہوئیں، جیسا کہ مودودی صاحبؒ اور اصلاحی صاحبؒ کا بیان ہے۔ یہ آیت (٤١) تو خود واضح کر رہی ہے کہ اسلامی ریاست کا قیام ابھی تک عمل میں نہیں آیا ہے، اگر بالفرض اس کے جواب میں کوئی یہ کہے کہ یہاں رسول اللہ کو منہا کر کے آئندہ کی مسلمان حکومتوں کا ذکر ہے، تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ نے سورہ بقرہ (٢ ہجری) کے نزول سے پہلے جن غزوات میں حصہ لیا، تو وہ کس حکم کی رو سے لیا تھا۔ کیونکہ محض مہاجرین کی معیت میں ہونے والے غزوہ ودان (صفر ٢ ہجری)، اور غزوہ بواط (ربيع الأول ٢ہجری) میں خود رسول اللہ بھی تو شریک تھے۔ یہ آیت(٤١) بھی اسی سورت کی کئی دیگر آیات کی طرح یہی بات واضح کرتی ہے کہ یہ سورت رسول اللہ کی ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل نہیں ہوئی، بلکہ مسلمانوں کی ہجرت کا عمل شروع ہوجانے کے بعد مکے میں ہی نازل ہوئی ہے۔ وہ لوگ جو مولانا مودودیؒ اور مولانا اصلاحیؒ کے مدینہ میں نزول کے نظریہ کے برخلاف سعید بن جبیر کی روایت سے جزوی کی بجائے مکمل نتیجہ اخذ کرتے ہوئے یہ مانتے ہیں کہ یہ آیات رسول اللہ کے سفر ہجرت میں ہی نازل ہوئی ہیں، وہ یہ دلیل دے سکتے ہیں کہ اگر اثنائے ہجرت کو مد نظر رکھا جائے تو رسول اللہ کی ابتدائی غزوات میں شمولیت کے تناظر میں اس سورت یا بالخصوص ان آیات کے دورِ نزول پر اس مضمون میں اٹھایا جانے والا یہ سوال باطل ہو جائے گا، کیونکہ دورانِ ہجرت نبی کریمؐ کو مدینہ کی حکومت نہیں ملی تھی۔ اگر سورت کے مضمون اور اسکے نظم کو تہس نہس کرتی اس روایت کو کچھ وقت کے لیے

بطور دلیل مان بھی لیا جائے تو اسی آیت (٤١) کا بقیہ حصہ غیر متعلق ہوجاتا ہے، کیونکہ اس میں مکہ والوں کو ان کے طرز اقتدار کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے، کہ تم لوگوں نے تو نماز، زکوۃ، معروف، منکر سب کو تماشا بنادیا ہے، اور مسلمانوں کو جب اقتدار ملے گا تو وہ یہ سب حرکتیں نہیں کریں گے۔ اگر اثنائے ہجرت میں یہ آیات نازل ہوئی ہوتیں، تو اس وقت حضرت ابوبکرؓ یا بدرقہ کے علاوہ کون ان آیات کا سامع ہوتا، یعنی مسلمان جماعت کے سامنے مدینہ پہنچ کرجب پہلی بار ان آیات کی تلاوت کی جاتی، تو اس وقت تو رسولؐ کو اقتدار مل ہی چکا تھا، کیونکہ یہ کام تو مدینہ جاتے ساتھ ہی ہوگیا تھا۔ مزید یہ کہ آیات کے مخاطب اصلی یعنی کہ مکے والوں تک بھی تو یہ پیغام دوران ہجرت نہیں پہنچ سکتا تھا، اور جب ہجرت کے بعد اس سورت کا متن ان لوگوں تک پہنچتا، تو اس وقت تک رسول اللہ مدینہ کے حاکم بن چکے تھے، گویا حقیقی مخاطب تک جب تنبیہی بیان پہلی بار پہنچتا، تو آیت میں بیان کردہ صورت حال تبدیل ہی ہو چکی ہوتی۔ قران کریم کے تدریجاً نزول کی ایک وجہ سورہ فرقان میں یوں بیان ہوتی ہے:

"منکرین کہتے ہیں کہ اِس شخص پر سارا قرآن ایک ہی وقت میں کیوں نہ اتار دیا گیا؟ ہاں، ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کو اچھی طرح ہم تمہارے ذہن نشین کرتے رہیں اور (اسی غرض کے لیے) ہم نے اس کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ الگ الگ اجزاء کی شکل دی ہے (٣٢) اور یہ لوگ تمہارے پاس جو (اعتراض کی) بات لاتے ہیں ہم تمہارے پاس اس کا معقول اور خوب مشرح جواب بھیج دیتے ہیں (٣٣)" (سورہ الفرقان)

یہاں یہ بیان ہوا کہ تدریجاً نزول کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بہترین طریقے پر بات کھول کر بیان کی جائے، سورہ حج کی ان آیات کو دوران ہجرت کا مانا جائے، تو اسکے بعد جب پہلی بار یہ آیات مدنی مسلمانوں کے سامنے تلاوت کی گئی ہوتی، یا مدینہ سے جب مکہ مشرکین تک پہنچی ہوتی، تو اس کا یہ متن اپنے مخاطبین کے لیے احسن تفسیر ہرگز نہیں کہلایا جاسکتا کہ جس میں کہا جارہا ہو کہ "اگر ہم اقتدار دیں تو۔۔۔"۔ سورہ فرقان میں قرآن کے آہستہ آہستہ نازل ہونے کی جو دلیل بیان ہوئی ہے، سعید بن جبیر کی روایت اس حکمت کے بھی خلاف جارہی ہے۔ آخر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ حکمران رسولؐ کی جانب سے جب یہ آیت پہلی بار مکہ پہنچتی، تو وہ لوگ آیت میں موجود اس شرطیہ حصے سے مطلب کیا اخذ کرتے، وہاں تو کوئی سعید بن جبیر نہیں بیٹھا تھا کہ مشرکین کو بتاتا کہ دراصل یہ آیات مکہ سے نکل جانے کے بعد اور مدینہ پہنچنے سے پہلے نازل ہوئی ہیں، اس لیے اسکا متن سمجھنے میں تم لوگوں کو دشواری ہورہی ہے۔ گویا جیسے ان آیات کا مدینہ پہنچ کر نازل ہونا ناممکن ہے، ویسے ہی یہ آیات اثنائے ہجرت کی بھی نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ یہ آیات بقیہ سورت کے ساتھ اپنی موجودہ ترتیب کے مطابق ہی مکی دور کے بالکل آخر میں نازل ہوئی ہیں۔

آگے چل کر مستقبل کے مسلمان حکومت کے خدوخال جب بیان ہوئے ہیں، تو نماز، زکوۃ، معروف منکر کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اس آیت کو اگر سورہ انفال کے تناظر میں دیکھا جائے، تو بات اور زیادہ واضح ہوجاتی ہے۔ کیونکہ سورہ حج اور سورہ انفال اس لحاظ سے ایک دوسرے کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں، کہ ایک میں ظالم قوم کے خلاف جہاد کی پہلی اجازت دی گئی ہے تو دوسری فیصلہ کن جہاد (غزوہ بدر) ہوجانے کے بعد نازل ہوئی ہے۔ سورہ حج میں مشرکین کی طرف سے عذاب کی جلدی مچانے کا ذکر ہے (حج، ٤٧)؛ تو سورہ انفال میں اب عذاب نازل کیے جانے کی وجہ سے آشنا کیا گیا ہے۔ رمضان ٢ ہجری میں غزوہ بدر ہوئی، جس میں مکہ کا مقتدر طبقہ مارا گیا، اور اسکے بعد پیدا ہونے والی صورت حال پر سورہ انفال (رمضان ٢ ہجری) نازل ہوئی، اور اس میں بدنی و مالی عبادات کو لیکر مکہ والوں کے اس مروجہ طرزعمل پر بھی تنقیدی بیان ہوا جو کہ وہ صدیوں سے اپنائے ہوئے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"اور وہ بات بھی یاد ہے جو اُنہوں نے کہی تھی کہ خدایا اگر یہ واقعی حق ہے اور تیری طرف سے ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا کوئی درد ناک عذاب ہم پر لے آ (۳۲) اُس وقت تو اللہ ان پر عذاب نازل کرنے والا نہ تھا جبکہ تو ان کے درمیان موجود تھا اور نہ اللہ کا یہ قاعدہ ہے کہ لوگ استغفار کر رہے ہوں اور وہ ان کو عذاب دیدے (۳۳) لیکن اب کیوں نہ وہ ان پر عذاب نازل کرے جبکہ وہ مسجد حرام کا راستہ روک رہے ہیں، حالانکہ وہ اس مسجد کے جائز متولی نہیں ہیں اس کے جائز متولی تو صرف اہلِ تقویٰ ہی ہو سکتے ہیں مگر اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے (۳۴) بیت اللہ کے پاس ان لوگوں کی نماز کیا ہوتی ہے، بس سیٹیاں بجاتے اور تالیاں پیٹتے ہیں پس اب لو، اِس عذاب کا مزہ چکھو اپنے اُس انکارِ حق کی پاداش میں جو تم کرتے رہے ہو (۳۵) جن لوگوں نے حق کو ماننے سے انکار کیا ہے وہ اپنے مال خدا کے راستے سے روکنے کے لیے صرف کر رہے ہیں اور ابھی اور خرچ کرتے رہیں گے مگر آخر کار یہی کوششیں ان کے لیے پچھتاوے کا سبب بنیں گی، پھر وہ مغلوب ہوں گے، پھر یہ کافر جہنم کی طرف گھیر لائے جائیں گے (٣٦)" (سورہ انفال، ۲ ہجری)

مکہ کے مقتدر طبقہ کی نفسایت پر سورہ انفال سور سورہ حج ایک دوسرے کا جوڑ بناتی ہیں، ایک بیان کرتی ہے کہ مکہ والے عذاب کی جلدی مچارہے ہیں، تو دوسری غزوہ بدر کے بعد بیان کرتی ہے کہ پہلے عذاب اس لیے نازل نہیں ہوا تھا کہ رسولؐ تمہارے درمیان موجود تھے۔ ایک مکہ میں نماز کو لیکر مسجد حرام کے ان ناجائز متولیوں کی غیر سنجیدگی کا ذکر کرتی ہے، تو دوسری بیان کرتی ہے، کہ مسلمان جب مقتدر ہونگے، تو نماز سے ایسے غافل نہ ہوجائیں گے، وہ تو نماز کو قائم کرنے والے ہونگے۔ ایک اگر اس وقت کے مکہ کی اشرافیہ کی مال کے حوالے سے پالیسی بیان کرتی ہے کہ وہ اگر مال خرچ کرتے ہیں تو اللہ کی راہ سے روکنے کے لیے، تو دوسری مسلمانوں کے حوالے سے بیان کرتی ہے کہ وہ جب اقتدار میں ہونگے، تو زکوہ پر کاربند رہیں گے۔اس آیت(٤١) کے آخر میں بیان کیا گیا کہ تمام معاملات کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، کہ گویا تم لوگ اپنی سی کوشش کرکے دیکھ لو، جو پچھلی آیات میں اللہ نے فرمایا ہے، یہ ہوکر رہے گا۔

اس آیت میں وصال نبویؐ کے بعد کی مسلم سیاست کا ایک واضح اشارہ موجود ہے، کہ اللہ نے مستقبل کی اسلامی ریاست کی باگ دوڑ مہاجر صحابہؓ کے ہاتھ میں دینے کا اشارہ کیا ہے۔ نہ صرف اشارہ کیا ہے، بلکہ ان کے بحیثیت حکمران طرز عمل کی بھی نشاندہی کی ہے کہ بدنی اور مالی عبادات کے ساتھ ساتھ امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر بھی کاربند رہیں گے۔ ٦ ہجری میں سورہ نور کے نزول کے بعد اللہ تعالیٰ نے اقتدار دینے کا لازمی وعدہ کرلیا:

"اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے اُن لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اُسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح اُن سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے، اُن کے لیے اُن کے اُس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جسے اللہ تعالیٰ نے اُن کے حق میں پسند کیا ہے، اور اُن کی (موجودہ) حالت خوف کو امن سے بدل دے گا ---(۵۵)(سورہ نور، ٦ ہجری)

سورہ حج کی آیت ۴۱ اور پھر سورہ نور کی آیت ۵۵کا مطالعہ یہ بیان کرتا ہے کہ پہلی تین خلافتیں ایک فریق کے ماننے کے برخلاف نہ صرف برحق تھیں، بلکہ انکے دیے جانے کا وعدہ خود اللہ نے کیا تھا۔ اسی طرح بعض روایات جو سقیفہ والے واقعہ کی خاصی رنگ آمیز منظر کشی کرتی ہیں، وہ بھی ایک درجہ میں دوبارہ پرکھی جانے کے قابل ہیں، کیونکہ مکہ والوں کو آئندہ خلافت ملنے کا اشارہ تو ہجرت سے بھی پہلے دیا جاچکا تھا، مدنی زندگی کے دس سال اگر ان آیات کی تلاوت انصاری صحابہؓ برابر کرتے رہے تھے، تو وصال نبویؐ کے بعد یکایک خلافت اپنے طبقہ میں لیجانے کے لیے کیونکر اس طرح کی میٹنگ کرتے، جیسا کہ روایات بیان کرتی ہیں۔ سقیفہ میں میٹنگ ضرور ہوئی ہوگی، اور حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت بھی وہیں ہی ہوئی ہوگی، لیکن اس وقت کی

عمومی منظر کشی جو بعض روایات کرتی ہیں، بالخصوص حضرت سعدؓ بن عبادہ اور حضرت عمرؓ کے حوالے سے، اس میں کسی حد تک زیب داستانی کی غرض سے بعد کے ادوار میں اضافہ ضرور ہوا ہے۔

آیت ٤٢-٥١ کا بیان:

وَإِن يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَعَادٌ وَثَمُودُ (٤٢) وَقَوْمُ إِبْرَاهِيمَ وَقَوْمُ لُوطٍ (٤٣) وَأَصْحَابُ مَدْيَنَ ۖ وَكُذِّبَ مُوسَىٰ فَأَمْلَيْتُ لِلْكَافِرِينَ ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ ۖ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ (٤٤) فَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَقَصْرٍ مَّشِيدٍ (٤٥) أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ۖ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (٤٦) وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ ۚ وَإِنَّ يَوْمًا عِندَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ (٤٧) وَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ أَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ أَخَذْتُهَا وَإِلَيَّ الْمَصِيرُ (٤٨) قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا أَنَا لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ (٤٩) فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ (٥٠) وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا مُعَاجِزِينَ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ (٥١)

"اے نبیؐ، اگر وہ تمہیں جھٹلاتے ہیں تو اُن سے پہلے قوم نوحؑ اور عاد اور ثمود (٤٢) اور قوم ابراہیمؑ اور قوم لوطؑ (٤٣) اور اہل مدین بھی جھٹلا چکے ہیں اور موسیٰؑ بھی جھٹلائے جا چکے ہیں ،پس میں نے منکروں کو مہلت دی پھر پکڑ لیا اب دیکھ لو کہ میری عقوبت کیسی تھی (٤٤) کتنی ہی خطاکار بستیاں ہیں جن کو ہم نے تباہ کیا ہے اور آج وہ اپنی چھتوں پر اُلٹی پڑی ہیں، کتنے ہی کنویں بیکار اور کتنے ہی قصر کھنڈر بنے ہوئے ہیں (٤٥) کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ اِن کے دل سمجھنے والے اور اِن کے کان سُننے والے ہوتے؟ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں (٤٦) یہ لوگ عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں اللہ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہ کرے گا، مگر تیرے رب کے ہاں کا ایک دن تمہارے شمار کے ہزار برس کے برابر ہُوا کرتا ہے (٤٧) کتنی ہی بستیاں ہیں جو ظالم تھیں، میں نے ان کو پہلے مہلت دی، پھر پکڑ لیا اور سب کو واپس تو میرے پاس ہی آنا ہے (٤٨) اے محمدؐ، کہہ دو کہ "لوگو، میں تو تمہارے لیے صرف وہ شخص ہوں جو (برا وقت آنے سے پہلے) صاف صاف خبردار کردینے والا ہوں (٤٩) پھر جو ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے اُن کے لیے مغفرت ہے اور عزّت کی روزی (٥٠) اور جو ہماری آیات کو نیچا دکھانے کی کوشش کریں گے وہ دوزخ کے یار ہیں (٥١)"

سورہ حج کیونکہ آخری مکی سورت ہے، تو اس میں سرسری طور پر ان کئی اقوام کا ذکر کیا گیا جنہوں نےاپنے رسولوںؑ کے ساتھ غلط طرز عمل کا مظاہرہ کیا تھا اور جن کا بار بار ذکر مکی سورتوں میں کیا گیا تھا۔ آیت ٤٢سے ٤٤ تک سات اقوام کا ذکر ہے، جن میں سے ابتدائی چھ کا ذکر انکی قوموں کے حوالے سے کیا گیا ہے کہ "ان قوموں نے جھٹلایا"۔جو اقوام عرب میں اپنے نبیؑ کا نام لیے بغیر بھی معروف تھیں، وہاں محض قوم کا ہی حوالہ دیا گیا ہے، یعنی عاد، ثمود اور اہل مدین، جبکہ باقی تین کا انکے نبیوںؑ کے ناموں کے ساتھ حوالہ دیا گیا ہے، یعنی کہ قوم نوحؑ، قوم ابراہیمؑ اور قوم لوطؑ، ساتویں قوم کا ذکر ابتدائی چھ اقوام کے ذکر سے منفرد یوں ہے کہ یہاں بات نبیؑ کے حوالے سے کی گئی ہے کہ "موسیٰؑ جھٹلائے گئے" نہ کہ" آل فرعون نے جھٹلایا"۔ قرآن کریم میں قوم نوحؑ، قوم ھودؑ (عاد)، قوم صالحؑ (ثمود)، قوم لوطؑ، قوم شعیبؑ (مدین) اور آل فرعون کے عذابوں کا ذکر پہلے بھی متعدد مقامات پر کیا جا چکا تھا، یہاں اس آیت میں صرف اشارہ کیا گیا ہے، جب کہ قومِ ابراہیمؑ پر کسی عذاب کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے۔ آیت (٤٤) کے اختتام پر جب حضرت موسیٰؑ کے جھٹلائے جانے کا ذکر ہے تو اس کے فوری بعد استفہامی انداز میں کہا گیا ہے کہ "میرا عذاب کیسا تھا"۔ اب جب قرآن نے قوم ابراہیمؑ کے عذاب کا ذکر نہیں کیا ہے، تو اس استفہامی جملے کا مطلب یہی ہے کہ یہاں عذاب کی بات صرف آخری مذکور قوم یعنی کہ آل فرعون کے حوالے سے کی گئی ہے، آل

فرعون کے جھٹلانے کے ذکر سے قبل ہی جملے کی ساخت معروف سے مجہول میں بدل جاتی ہے یعنی کہ "فلاں قوم نے جھٹلایا" کی بجائے"موسیٰؑ جھٹلائےگئے" کرکے بیان کیا گیا ہے، یعنی یہاں سے جملے کا محور قوم کی بجائے رسولِؐ وقت کو بنایا جارہا ہےاور اسی کے فوری بعد عذاب کا ذکرکرکے یہ توجہ کرائی جارہی ہے کہ فرعون کے عذاب کی طرف توجہ کرلو کہ جب وہ ہمارے رسولؑ کے راستہ میں حائل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان آیات میں مذکور باقی انبیاء کا ذکر جب قرآن میں پہلے کیا گیا ہے تو انکی قوموں کی طرف سے انکے ہجرت کے عمل میں مخل ہوجانے کا کوئی ذکر نہیں ہے، صرف حضرت موسیؑ کا ذکر اس حوالے سے کیا گیا ہے کہ جب فرعون نے انکی ہجرت میں رکاوٹ بننے کی کوشش کی تو اس وقت وہ عذاب سے دوچار ہوا۔ سورہ طٰہٰ آیات ۷۷ اور ۷۸ میں ارشاد ہوتا ہے:

"ہم نے موسیٰؑ پر وحی کی کہ اب راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چل پڑ، اور اُن کے لیے سمندر میں سے سُوکھی سڑک بنا لے، تجھے کسی کے تعاقب کا ذرا خوف نہ ہو اور نہ (سمندر کے بیچ سے گزرتے ہوئے) ڈر لگے (۷۷) پیچھے سے فرعون اپنے لشکر لے کر پہنچا اور پھر سمندر اُن پر چھا گیا جیسا کہ چھا جانے کا حق تھا (۷۸)" (سورہ طٰہٰ)

گویا سورہ الحج کی اس آیت میں یہ اشارہ کردیا گیا کہ تم لوگ جتنے جتن کرلو، اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ کو بحفاظت مدینہ پہنچادیگا، اور آیت ۳۹ میں تو پہلے ہی جہاد کی اجازت دیکر واضح کردیا گیا ہے کہ تم لوگوں پر عذاب میدان جنگ (بدر) میں آئے گا۔

آیت ۴۵ اور ٤٦ میں عذاب شدہ بستیوں کے کھنڈرات کا ذکر ہے کہ جن سے مکہ والے بخوبی واقف تھے، لیکن ان سے عبرت نہیں لے رہے تھے، اصل بات یہ ہے کہ سب کچھ اپنی انکھوں دیکھا اور کانوں سنا تھا، لیکن جوں صرف اس لیے نہیں رینگ رہی تھی کہ ضمیر مردہ ہوچکے تھے۔ آگے آیت ٤۷ اور ٤۸ میں مکہ والوں کے اس چیلنج کا ذکر ہے کہ اگر ہمیں عذاب سے ڈرایا جارہا ہے، تو اسکو لایا کیوں نہیں جارہا، اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت سے اگاہ ہے کہ وہ لوگوں کو پورا موقع دیتا ہے رجوع کرنیکا، تم لوگ عذاب کی جلدی مچاتے ہو، لیکن وہ عذاب دینے میں جلدی نہیں کرتا ہے، لیکن اس کا وعدہ برحق ہوتا ہے، اور یہ وقت تم لوگوں کے لیے مہلت ہے کہ اب بھی رجوع کرلو، ورنہ عذاب تو تیار ہی ہے، کہ جس کے اشارے قرآن میں پہلے بھی جا بجا دیے گئے ہیں۔ آیت٤۹ میں رسول اللہ کو فرمایا گیا ہے کہ آپ کا کام خبردار کرنا ہے، عذاب کس وقت لانا ہے، وہ اللہ کی مرضی پر ہے کہ وہ کب لاتا ہے، آپؐ ان لوگوں کی خواہش پر وہ جلد نہیں لا سکتے ہیں، نہ عذاب لانا آپؐ کا کام ہے، وہ اللہ کا وعدہ ہے اور عذاب اپنے وقت پر ہی آئے گا۔ آیت ۵۰ میں بیان ہے کہ جو لوگ اب بھی ایمان لے آئیں، تو انکے لیے بخشش اور عزت کی روٹی دونوں کا وعدہ ہے۔ مکہ والوں نے حرم کی مجاوری اختیار کی ہوئی تھی، جہاں زمانے بھر کی قوموں کے بت تھے، نبی کریمؐ کی مخالفت میں جہاں بنیادی نظریہ یہ تھا کہ اسلام میں ہمارے آباؤ اجداد کے طریقہ کے خلاف بات ہورہی ہے وہیں کہیں پر یہ معاشی پہلو بھی پنہاں تھا کہ اگر عرب کی رسومات کے برخلاف ہم موحد ہوگئے، توعرب یا تو ہمارا قلع قمع کردیں گے، یا پھر حرم سے اپنے آپ کو لاتعلق کرلیں گے، جس کا براہ راست اثر ان لوگوں کی معاش پر پڑنا تھا، آیت ۵۱ میں پھر واضح کیا گیا کہ جن لوگوں نے ہماری آیات میں ہمیں عاجز کرنے کی کوشش کی وہ اہل دوزخ میں سے ہیں۔ یہاں پچھلی آیات کے حوالے سے ہی گفتگو چل رہی ہے، اور پچھلی آیات میں مسلمانوں کی ہجرت اور جہاد کی بات ہوئی ہے، اور پھر حضرت موسیٰ کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ جب فرعون نے ان کو جھٹلایا تو دنیاوی عذاب سے بھی ہمکنار ہوا، اور آخرت میں بھی اسکا شدید عذاب ہے۔

تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو ہجرت کے روز دارالندوہ میں میٹنگ ہوئی تھی۔ جس کا احوال سورہ انفال (۳۰) میں دیا گیا ہے۔ ابن سعد بیان کرتے ہیں کہ ابو جہل نے رائے دی کہ ہم قریش کے ہر ہر

قبیلے کا ایک ایک شخص لے لیں جو بہادر اور دلیر ہو، پھر اسے ایک تیز تلوار دیں، تاکہ یہ سب مل کر آنحضرتؐ کو ماریں تو آپکا خون تمام قبائل میں تقسیم ہوجائے گا، اور بنی عبد مناف کے سمجھ میں نہیں آئے گا کہ اس کے بعد کیا کریں۔ گویا اس روایت کے مطابق بنی عبد مناف (بنو ہاشم و بنو امیہ و بنو نوفل) کے علاوہ دیگر قبائل سے ایک ایک شخص لینے کی تجویز دی گئی۔ دوسری جانب ابن اسحٰق کی روایت اس میٹنگ کا آغاز ہی بنو امیہ سے کرتی ہے اور شرکاء میں عتبہ، شیبہ اور حضرت ابو سفیانؓ کا نام سب سے پہلے بیان کرتی ہے۔

ابن سعد نے میٹنگ کے شرکاء کا نام تو بیان نہیں کیا تاہم جن لوگوں نے قتل کرنے کے ارادے سے گھر کا محاصرہ کیا تھا ان کے نام بیان کیے ہیں جن میں ابو جہل کے علاوہ حکم بن ابی العاص، عقبہ بن ابی معیط، نذر بن حارث، امیہ بن خلف، ابن الغیطلہ، زمعہ بن الاسود، طعیمہ بن عدی، ابو لہب، ابی بن خلف، نبیہہ بن حجاج اور منبہ بن حجاج شامل تھے۔ ان میں سے حکم بن ابی العاص، عقبہ بن ابی معیط بنی عبد مناف کی بنو امیہ کی شاخ میں سے تھے۔ طعیمہ بن عدی بنی عبد مناف کی بنی نوفل شاخ سے تھا۔ جب کہ ابو لہب رسول اللہ کا چچا اور بنی عبد مناف کی بنی ہاشم شاخ کا سردار تھا۔ جب کہ دیگر کا تعلق قریش کے دوسرے خاندانوں سے تھا۔ سوال یہ ہے کہ اگر میٹنگ کے اندر ابو جہل نے بنی عبد مناف کو بدلہ لینے سے روکنے کے لیے متعدد قاتلوں کی تجویز دی تھی جو کہ منظور بھی ہوئی تو گھیراؤ کرنے والوں میں چار افراد کا تعلق بنی عبد مناف سے کیوں کر ہوتا۔

دوسری جانب ابن اسحاق جب میٹنگ کا احوال بیان کرتے ہیں تو ابو جہل کی تجویز میں بنی عبد مناف کا ذکر نہیں ہے بلکہ ان کی قوم کا ذکر ہے کہ اگر سب خاندانوں کے جواب یکبارگی تلوار ماریں گے تو رسول اللہ کا خاندان بدلہ لینے کا قادر نہیں رہے گا لامحالہ خون بہا پر راضی ہو جائے گا۔ ابن اسحاق کے مطابق اس میٹنگ میں عتبہ ، شعبہ، ابو سفیان (بنی امیہ)، طعیمہ بن عدی، حرث بن عامر، اور جبیر بن مطعم (بنو نوفل)، نذر بن حارث (بنی عبد الدار)، ابو البختری بن ہشام، زمعہ بن الاسود، حکیم بن حزام (بنی اسد)، نبیہہ بن حجاج، منبہ بن حجاج (بنی سہم) اور امیہ بن خلف (بنی جمیہ) سے قابل ذکر تھے۔ ابن اسحاق کی اس فہرست میں اگرچہ بنو ہاشم سے کوئی شامل نہیں تاہم بنی عبد مناف کی دیگر دو شاخوں بنی امیہ اور بنی نوفل سے ٦ افراد کا ذکر کیا ہے جن میں سے دو (حضرت ابو سفیانؓ اور حضرت جبیرؓ بن مطعم) بعد میں مسلمان بھی ہوئے۔ اس کے علاوہ میٹنگ کے بیان کردہ شرکاء میں سے حضرت حکیمؓ بن حزام نے بھی اسلام قبول کیا۔ جہاں تک حکیمؓ بن حزام کا تعلق ہے تو وہ تو بعثت سے پہلے ہی بٹ پرستی چھوڑ چکے تھے۔ نبی کریمؐ کے ساتھ کسی براہ راست جھگڑے میں ان کا ذکر بھی نہیں ملتا بلکہ مودت کے ہی اشارے ملتے ہیں۔ آخر وہ کیونکر اس ناپاک منصوبے کا حصہ بن سکتے تھے۔ جبیر بن مطعم کے والد مطعم بن عدی مسلمان تو نہیں تھے لیکن طائف کے سفر سے واپسی پر انھوں نے ہی رسول اللہ کو مکہ داخلہ کے وقت پناہ دی تھی اور اپنے بیٹوں کے ساتھ کعبہ میں اس کا اعلان کیا تھا۔ بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد جب مدینہ والوں کو منیٰ سے جلد بازی میں نکلنا پڑا تھا اور مکہ والوں نے حضرت سعدؓ بن عبادہ کو پکڑ کر تشدد کا نشانہ بنایا تھا تو اس وقت بھی مطعم بن عدی ہی کی مداخلت سے حضرت سعدؓ کو رہائی ملی تھی۔ نبی پاکؐ مطعم بن عدی کا اتنا لحاظ کرتے تھے کہ غزوہ بدر کے بعد جنگی قیدیوں کے متعلق رسول پاکؐ نے فرمایا کہ اگر آج مطعم بن عدی زندہ ہوتا مجھ سے ان ناپاکوں کے متعلق کہتا تو میں ان لوگوں کو صرف اس کی خاطر (فدیہ دیے بغیر) رہا کر دیتا(صحیح بخاری، کتاب فرض الخمس)۔ جس وقت ہجرت ہوئی اس وقت مطعم بن عدی حیات تھا یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایسے باپ کی موجودگی میں جبیر اس ناپاک ارادے کا عملا حصہ بنتا چاہے وہ دل سے اس منصوبے کا حمایتی ہی کیوں نہ ہوتا۔ آخر طائف سے واپسی پر جب پناہ دی تھی تو اس وقت بھی اپنے باپ کے ساتھ آیا تھا۔ بعض روایات کی رو سے تو بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد حضرت سعدؓ بن عبادہ کی رہائی جبیر بن مطعم ہی کی وجہ

سے ہوئی تھی۔ جہاں تک حضرت ابو سفیانؓ اور حکمؓ بن العاص کا تعلق ہے تو ان دونوں کا بعد کے زمانے کی اسلامی تاریخ سے گہرا تعلق ہے۔ حکمؓ بن العاص مروانؒ کے باپ تھے اور حضرت ابو سفیانؓ حضرت امیر معاویہؓ کے۔ دور بنو امیہ میں انہی دونوں کی نسلوں نے حکمرانی کی ہے۔ بنو امیہ کے ابتدائی تین خلیفہ حضرت ابو سفیانؓ کی اولاد میں سے تھے اور بعد کے تمام حکم ؓبن العاص کی اولاد میں سے تھے۔ لہٰذا ان دونوں افراد کا اضافہ تو اس زمانے کی باغی تحریکوں کی سیاسی ضرورت بھی تھا کہ جس زمانے میں واقدی (ابن سعد کے استاد) اور ابن اسحاق موجود تھے۔ جب کہ ابو لہب کا نام اس لئے ناممکن ہے کہ چاہے ابو جہل نے سکیم پیش کرتے ہوئے عبد مناف کہا ہو چاہے بنی ہاشم مراد ہو تو ابو لہب تو دونوں کا حصہ تھا اور اس وقت بنی ہاشم کا سردار تھا۔ اگر سردار خود ہی اپنے قبیلہ کے فرد کے قتل میں ملوث ہوتا تو بنی ہاشم کا بدلہ لینے کا سوال ہی کیا ہوتا؟ خواہ قصاص کی صورت میں ہوتا خواہ خون بہا کی۔

ان پانچ ناموں کو چھوڑ کر کہ جن کا دیگر وجوہات کی بنا پر رسول اللہ کے گھر کی ناکہ بندی میں شامل ہونا مشکوک ہے ،باقی تمام ہی افراد غزوہ بدر میں مارے گئے ہیں۔ جیسے فرعون کا لشکر حضرت موسیٰ کے آڑے آنے پر غرق آب ہوا، یہ لوگ بھی اللہ کے وعدے کے عین مطابق ہجرت میں رکاوٹ ڈالنے کے باعث ویسے ہی عذاب کا شکار ہوئے، جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے ان سے سورہ قمر میں کر چکا تھا۔ ارشاد ہوتا ہے:

"اور آل فرعون کے پاس بھی تنبیہات آئی تھیں (٤١) مگر انہوں نے ہماری ساری نشانیوں کو جھٹلا دیا آخر کو ہم نے انہیں پکڑا جس طرح کوئی زبردست قدرت والا پکڑتا ہے (٤٢) کیا تمہارے کفار کچھ اُن لوگوں سے بہتر ہیں؟ یا آسمانی کتابوں میں تمہارے لیے کوئی معافی لکھی ہوئی ہے؟ (٤٣) یا اِن لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ ہم ایک مضبوط جتھا ہیں، اپنا بچاؤ کر لیں گے؟ (٤٤) عنقریب یہ جتھا شکست کھا جائے گا اور یہ لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگتے نظر آئیں گے (٤٥) بلکہ اِن سے جس ناگوار گھڑی کا وعدہ ہے بلاشبہ وہ ناگوار گھڑی بڑی سخت اور بہت تلخ ہے ۔(٤٦) " (سورہ قمر)

سورہ قمر جس وقت نازل ہوئی تھی اس وقت اللہ تعالیٰ نے تو مسلمانوں کو ہاتھ اٹھانے سے ہی روکا ہوا تھا۔ مشرکین کے مظالم اتنے بڑھ چکے تھے کہ بہت سے لوگوں کو حبشہ ہجرت کرنا پڑ چکی تھی۔ اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ عنقریب وہ وقت بھی آئے گا کہ کافروں کو مسلمانوں کے سامنے سے جتھے کی صورت میں پیٹھ پھیر کر بھی بھاگنا پڑے گا اور محض صرف یہی نہیں بلکہ وہ وقت اس سے بھی کئی گنا زیادہ سخت ہو گا۔ بدر کے موقع پر ٧٠ کافر مارے گئے اور اتنے ہی گرفتار ہوئے اور ان کے سرداروں کی تقریباً پوری کھیپ ختم ہو گئی اور بالخصوص وہ لوگ جن کو رسول اللہ کی ہجرت میں آڑے آنے سے منع کیا گیا ہے وہ سب بھی مارے گئے۔ سورہ قمر میں تو ممکنہ جنگ کا واضح اشارہ تھا لیکن اور بھی مکی سورتوں میں اس آنے والی جنگ کا اشارہ ملتا ہے جیسے سورہ روم میں فرمایا گیا کہ عنقریب رومی غالب آئیں گے تو یہ وہ دن ہو گا جب اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان بھی خوشیاں منا رہے ہوں گے۔

بازی پلٹ جانے کے عملی اقدام کا آغاز سورہ حج سے ہی ہو رہا ہے کہ جہاں ہجرت کر جانے والے مسلمانوں کو جہاد کی اجازت دی جا رہی ہے اور مشرکین مکہ کی اشرافیہ اور بالخصوص وہ لوگ جنھوں نے براہ راست نبی کو ہجرت سے روکنے اور قتل کرنے کی کوشش کی وہ غزوہ بدر میں مارے گئے۔